جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام	:	سائنس اور غالبؔ
مصنف	:	ڈاکٹر وہاب قیصر
اشاعت اول	:	2000ء
تعداد	:	1000
سرورق	:	سعادت علی خاں
کمپیوٹر کتابت	:	الاکرم گرافکس فون : 4073394 16-1-14/4 ڈاکٹر ذاکر حسین کالونی، سعید آباد، حیدرآباد 59
طباعت	:	ایس۔کے پرنٹر، نارائن گوڑہ، حیدرآباد
قیمت	:	125 روپئے
ناشر	:	سائنس اویرنس اینڈ پروموشن ٹرسٹ
مصنف کا پتہ	:	جہاں نما 19-2-27/A/1/1 حیدرآباد - 500053

ملنے کے پتے

* روزنامہ سیاست سیل کاؤنٹر، جواہر لال نہرو روڈ، حیدرآباد - 1
* دفتر شگوفہ، 31 بیچلرس کوارٹرس، حیدرآباد - 1
* حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد - 2
* مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی - 25
* مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، دہلی - 6
* مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، یونیورسٹی مارکٹ، علی گڈھ - 2
* مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی - 3

میری شریکِ حیات

نصرت زمانی

کے نام

مختصر تعارف

قلمی نام	:	وہاب قیصر
اصلی نام	:	سید عبدالوہاب
ولدیت	:	سید عبدالستار مسکین صاحب (مرحوم)
پیدائش	:	5/ سپٹمبر 1949، حیدرآباد
تعلیمی قابلیت	:	ایم ایس سی، پی ایچ ڈی (عثمانیہ)
پیشہ	:	تدریس
عہدہ	:	پرنسپل ممتاز کالج، ملک پیٹ، حیدرآباد - 36
ادبی سفر	:	1968ء میں افسانہ نگاری سے شروع ہوا۔

1970ء سے سائنسی موضوعات پر لکھنے کا سلسلہ قائم ہوا جو اب تک جاری ہے۔

سائنسی مضامین دہلی کے جرائد کتاب نما، آجکل، سائنس اور پیام تعلیم میں اور حیدرآباد کے آندھرا پردیش، قومی زبان اور روزنامہ سیاست میں پابندی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔

دیگر تصانیف

(1) سائنس کے نئے اُفق (1996) سائنسی مضامین

(2) سوالوں میں رنگ بھرے (زیرترتیب) سائنسی مضامین

(3) خواتین اور سائنس (زیرترتیب) سائنسی مضامین

فہرست

(i)	غالبؔ کا کائناتی شعور	ڈاکٹر وزیر آغا	6
(ii)	حرفے چند	پروفیسر گوپی چند نارنگ	8
(iii)	غالبؔ کا وِجدانی ادراک	پروفیسر یم تقی خاں	9
(iv)	دشتِ اِمکاں		11
1 -	غالبؔ کا سائنسی شعور		15
2 -	سائنس اور غالبؔ		31
3 -	غالبؔ کے سائنسی اشعار، ماہرین علم و ادب کی نظر میں		89
4 -	کتابیات		158

غالبؔ کا کائناتی شعور

مجھے ڈاکٹر وہاب قیصر کی کتاب ''سائنس اور غالبؔ'' کے مسودہ کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں انھیں قابل مبارکباد سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مطالعہ غالب کے سلسلے میں ایک بالکل نئے اور اچھوتے موضوع کو تحقیق اور تنقید کے لئے چنا ہے۔ ہر چند غالبؔ پر کام کرنے والے دیگر ناقدین کے ہاں بھی غالبؔ کے سائنسی شعور کی طرف اشارے ملتے ہیں مگر غالب کے سائنسی شعور کا مبسوط مطالعہ ان میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔ ویسے ڈاکٹر وہاب قیصر اس کے لئے موزوں ترین شخصیت بھی تھے کیوں کہ وہ طبیعیات کے پی ایچ ڈی ہیں اور تقریباً تین دہائیوں سے سائنس کے مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے رہے ہیں۔

سائنسی مطالعہ کے دو پہلو ہیں ——— ایک مادّہ اور مادّہ سے مرتب ہونے والی صورتوں کا مطالعہ اور دوسرا کائناتی شعور! دلچسپ بات یہ ہے کہ مادّہ وہ ''کثیف'' شئے ہے جس کی دونوں اطراف کھلی ہیں۔ ایک طرف سفر کریں تو کائناتِ اکبر (MACRO) کا ادراک ہوتا ہے جب کہ دوسری طرف سفر کریں تو کائناتِ اصغر (MICR0) کا۔ مگر کائناتِ اکبر پیشِ نظر ہو یا کائناتِ اصغر، انسان کی ایک بے نہایت ''منطقے'' تک رسائی ضرور ہوتی ہے ——— ایک ایسا منطقہ جہاں ریاضی کے سارے کلیئے حتیٰ کہ زمان و مکان تک ختم ہو جاتے ہیں۔ طبیعیات کی جدید ترین ایم۔ تھیوری نے اس منطقے کو کبھی MURKY کہا ہے اور کبھی MATRIX، کبھی MYSTERY اور کبھی MAGIC اور کبھی چاروں اور ان کے علاوہ بھی کئی اوصاف گنوائے ہیں۔ میں نے اپنی محدود سوچ کو بروئے کار لاتے ہوئے اس فہرست میں MOULD اور MIND کو بھی شامل کر لیا ہے اور اپنے بعض مضامین میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ ''مقام'' ہے کہ جہاں کائناتِ اکبر

کے راستے سے آئیں یا کائناتِ اصغر کے راستے سے، مآل کار آپ اس پر اسراریت کی دہلیز تک ہی پہنچیں گے جس کی کوئی نہایت نہیں ہے۔

غالب کے سائنسی شعور کو ''اشیا'' اور مظاہر کا ''مشاہدہ'' اور ''کائنات کا ادراک'' —— ان دونوں زاویوں سے دیکھنا چاہیے۔ غالب اشیا اور مظاہر پر غور کرتا ہے۔ (ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے یا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا) اُس کے ہاں بے پناہ تجسس ہے جو استقرا کی طریق INDUCTIVE METHOD اختیار کرنے پر اسے اکساتا ہے (یہ سائنسی رویہ ہے) اس حوالے سے غالب نے اپنے زمانے کی ٹیکنولوجی کے ثمرات کو بھی غور سے دیکھا ہے۔ وہ دھواں گاڑی یا تار برقی اور دیگر سائنسی ایجادات کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطالعہ سائنس سے ماخوذ نہیں ہے۔ مثلاً پانی کا ہوا میں تبدیل ہو جانا ایک ایسی بات ہے جس کا علم ازمنۂ قدیم ہی سے لوگوں کو تھا مگر پانی کے بخارات کا قوت میں تبدیل ہو کر ایجادات کی صورت میں آنا، یہ سائنس ہی کا کرشمہ تھا۔ غالب نے اس کرشمے کو غور سے دیکھا اور دیگر لوگوں سے کہیں زیادہ اس پر غور کیا اور متاثر بھی ہوا۔ مگر غالب کے ہاں سائنسی ایجادات کے پس منظر میں سائنسی تجربات یا ریاضیاتی عمل کی کوئی جانکاری نہیں تھی۔ لہٰذا سائنسی شعور کے اس پہلو کے حوالے سے ہم غالب کو زیادہ سے زیادہ ایک ناظر یا شاہد کا رتبہ دے سکتے ہیں۔ مگر غالب کی اصل حیثیت سائنسی شعور کے دوسرے پہلو یا زاویئے کی وجہ سے ہے۔ یعنی وہ پہلو جو ''کائناتی شعور'' پر منتج ہوتا ہے۔ غالب کے اہم ترین اشعار وہی ہیں جن میں یہ کائناتی شعور نمو پذیر ہوا ہے جہاں پوری کائنات غالب کی مٹھی میں ہے اور جہاں وہ دشتِ اِمکاں کو اس تیزی سے عبور کرتا ہے کہ اُسے اپنا اگلا قدم رکھنے کے لئے جگہ ہی نہیں ملتی۔ ڈاکٹر وہاب قیصر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غالب کے اس کائناتی شعور کی قوت کا احساس دلایا ہے۔ یہی اس قیمتی کتاب کا جواز بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اہلِ نظر وہاب قیصر کی اس سعی کو ہر اعتبار سے مستحسن اور خیال انگیز پائیں گے اور ان کی اس کتاب کو غالبیات کے سلسلے میں ایک اہم اضافہ قرار دیں گے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

حرفے چند

شاعری یا تخلیق کا مرتبہ ہر شئے سے بلند اسی لئے ہے کہ شاعر کے تخیّل کا پرِ پرواز چشم زدن میں اُن افلاک سے بھی آگے نکل جاتا ہے اور ایسے ایسے حقائق کا انکشاف کر لیتا ہے جہاں تک پہنچنے میں تعقل کو ارتقائی سفر طے کرنے میں صدیاں لگتی ہیں۔ ہر چند کہ شعری حقیقت ایک الگ نوع کی حقیقت ہے جو مبنی بر مجاز و قیاس ہوتی ہے اور شاعری کا اعجاز اسی میں ہے کہ وہ اپنی منطق خود وضع کرتی ہے۔ تاہم عظیم شعراء کے یہاں بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب حقیقت وضعی اور غیر وضعی میں عجیب و غریب تطبیق کا سماں دیکھنے کو ملتا ہے۔ غالبؔ ہر چند کہ نہ سائنس داں تھے نہ حکیم و فلسفی، لیکن ان کے اشعار میں کہیں کہیں سائنسی حقائق کوندے کی طرح لپک جاتے ہیں اور شعری منطق اپنی بات منوا لیتی ہے۔ ڈاکٹر وہاب قیصر نے ایک بالکل الگ زاویئے سے کلامِ غالبؔ پر نظر ڈالی ہے۔ وہ ماہر سائنس داں ہیں۔ یقین ہے شائقین غالبؔ اس کتاب کو گہری دلچسپی سے پڑھیں گے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

غالبؔ کا وِجدانی ادراک

ڈاکٹر وہاب قیصر کی کتاب ''سائنس اور غالبؔ'' ان کے سائنسی مزاج اور ادبی ذوق کا امتزاج ہے۔ سائنسی باقاعدگی، طرزِ فکر اور اظہارِ بیان کی صحت کو ادب کے لطیف پیراؤں کے ساتھ امتزاج، شائد اکیسویں صدی کی نئی فکر کا آغاز ہے۔

ادب اور سائنس سطحی طور پر دو ایسی حقیقتیں نظر آتی ہیں جن میں بعد المشرقین ہو لیکن نظر غائر سے آپ دیکھیں تو دونوں خیالات اور قلب کی کیفیات ہیں۔ دونوں فطرت کے حسن کے متلاشی ہیں۔ ایک فطرت کو اپنے مطالعہ، تحلیل، تکمیل اور پیمائش سے ایک نظریہ یا مساوات کی شکل میں ظاہر کرتا ہے اور دوسرا فطرت کے حسن کو اپنے شعر میں ڈھال لیتا ہے۔ یہ قلبی کیفیت عین الہامی ہوگی۔ شعر میں بھی سائنسی الہامیت آجاتی ہے۔ یہی حال غالبؔ کے چند اشعار کا ہے جن میں مفاہیم کے دفاتر پوشیدہ ہیں۔ ہر پڑھنے والے کو اپنے حدود ادراک کی مناسبت سے ان مفاہیم کا کوئی نہ کوئی گوشہ ہاتھ لگتا ہے۔ ڈاکٹر قیصر نے بڑی باریک بینی اور مطالعہ سے اُن سارے مفاہیم کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے کہ آئندہ پڑھنے والا خود کوئی نیا گوشہ تلاش کر لے۔ مجھے غالبؔ کے ان اشعار میں دو اشعار بڑے عظیم مطالب کے حامل نظر آئے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

یہ خالق کائنات کی خود پیدائی اور خود آشکارائی ہے جس نے واجب الوجود کے مجرد صفات کو تفصیلی کر دیا۔ یہی خلقت کے ذریعہ ظہورِ صفات کی منزل ہے۔ آئینۂ بادِ بہاری نورِ اول کائنات ہے۔ نور حضورؐ ختمی مرتبت جس کے انعکاس صفات سے کائنات کا جلوہ ہے۔ اگر حضورؐ نہ ہوتے تو کائنات نہ ہوتی۔ نورِ مطلق واجب الوجود کے مقابلے میں نورِ اول کثیف ہے جو جلوہ گرِ کائنات ہے۔

دوسرا شعر

رفتارِ عمر قطع رہِ اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

یہ شعر زمان و مکان کی ماہیت ظاہر کرتا ہے کہ وہ شعوری ہے۔ وہ اضافی نہیں، مطلق نہیں۔ شعور کے بغیر زمان و مکان کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ اس کا وجود ہے۔ اس شعر پر مضامین کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں۔ بیسویں صدی کے نظریات کو غالبؔ نے اپنی الہامی شاعری کے ذریعہ انیسویں صدی میں بیان کیا ہے۔

غالبؔ کا وجدانی ادراک کئی اشعار سے ظاہر ہے جو اپنے زمانے سے سو سال آگے ہیں۔ انیسویں صدی الحاد کا زمانہ تھا جہاں کائنات کی ہر چیز کو متعین سمجھا جاتا ہے۔ غالبؔ کی کائنات ایک متحرک کائنات ہے جس میں خالق کی ہر آن ایک نئی شان ہے۔ یہ مردہ خیالی کی دنیا سے روشنی کا سفر ہے، ادراک اور تخیّل کی بلندی کا سفر ہے۔

جس طرح غالبؔ نے قلبی واردات کو اپنے سیدھے سادھے اشعار میں بیان کردیئے وہ سہل ممتنع کے شہ پارے ہیں۔ اس طرح سائنسی حقائق کا اظہار مساوات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ مساوات حسن کائنات کو ظاہر کرتی ہے۔ سائنس کی عظیم مساوات ہمیشہ سادہ رہتی ہے جیسے آئن اسٹائن کی مساوات۔ سائنس اب تک ایک ایسی مساوات کی تلاش میں ہے جس میں کائنات کی ساری رنگینیوں کو سمودیا جاسکے۔ یہی مساوات ایک عظیم شعر ہوگی۔

ڈاکٹر وہاب قیصر نے غالبؔ کے اشعار کی تشریح کے ساتھ ساتھ سائنس کے بنیادی اصول بھی بہت ہی سہل اور عام فہم زبان میں بیان کردیئے ہیں۔ یہ کتاب غالبؔ کے اشعار کی تشریح کے ساتھ ساتھ خود سائنس کی مبادیات کو ایک ایسے مبتدی کے لئے جو سائنس سے ناواقف ہو اچھی طرح ذہن نشین کرواتی ہے۔ ڈاکٹر قیصر کا اسلوب بیان اس قدر دلکش اور متاثر کن ہے کہ دلنشین ہوجاتا ہے۔ میں ڈاکٹر قیصر کو اس تخلیق پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے ثابت کردیا ہے کہ سائنس داں زاہدِ خشک نہیں بلکہ صاحبِ دل اور حساس ہوتے ہیں۔

پروفیسر یم تقی خاں

نامور سائنس داں

دشتِ امکاں

سائنس اور غالبؔ! جی ہاں!! عنوان بھی نیا ہے اور موضوع بھی۔ سائنس سے حد درجہ دلچسپی نے ہر واقعہ کو سائنس کے تناظر میں دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے، بلکہ تمام مظاہر قدرت میں پوشیدہ سائنسی رموز خود بخود نظر میں آ جاتے ہیں۔ یہ ایک مصدقہ امر ہے کہ جس کا جو علم وفن سے تعلق ہوگا ہر ایک میں اس کو وہی نظر آئے گا۔ چاہے عمومی طور پر وہ اس سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ نظر آتا ہو۔ اب مرزا غالب ہی کو لیجئے جو انیسویں صدی کے مایہ ناز شاعر گذرے ہیں۔ بظاہر ان کا فن ظریفانہ، شوخیانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ شاعری پر محیط ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں ہمیں سائنس کی پردہ دری نظر آتی ہے۔ ان ہی تمام خصوصیات کی بنا پر وہ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے شعروادب کی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی وہ سائنس سے ایک قسم کی مماثلت رکھتے ہیں جو ساری دنیا کی تہذیب وتمدن پر چھائی ہوئی ہے۔ اس طرح دونوں ہی آفاقی ہیں اور سارے زمانے پر اپنا اثر رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری کے مضامین میں اور سائنسی اصولوں میں مطابقت کا پایا جانا ہمیں اس کتاب کی پیش کشی پر مجبور کر دیا ہے۔

ماہ مارچ 1998ء کی بات ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام، ایوان اردو، پنجہ گٹہ حیدرآباد میں غالبؔ سیمنار کا انعقاد عمل میں آیا تھا جس میں شہر کے ماہرین شعروادب نے غالبؔ کی شخصیت اور فن پر مقالے پیش کئے۔ ہم بھی اس سیمنار میں شریک تھے، جہاں ہمیں غالبؔ کی شاعری سے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل غالبؔ کے کلام کو بس اتنا ہی پڑھ سکتے تھے جتنا کہ داخلِ نصاب تھا۔ بقول غالبؔ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

کے مصداق، دورانِ سیمنار رہ رہ کر یہ سوال ہمارے ذہن میں اُبھرا کہ کیا کہیں غالبؔ نے اپنے اشعار میں سائنسی موضوعات کو موزوں کیا ہے؟ یہ سوال جتنا دلچسپ تھا اتنا ہی چیلینجنگ بھی! پھر ہم نے ٹھان لی کہ غالبؔ کو سائنسی نقطۂ نظر سے پڑھیں گے۔ پھر کیا تھا۔ دوسرے ہی دن کالج کی لائبریری سے دیوانِ غالبؔ کا نسخہ حمیدیہ اور آغا محمد باقر کی شرح لے آئے۔ شرح کی مدد سے جب اشعار کا مطالعہ کرنے لگے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب ہم نے دیکھا کہ غالبؔ کے ہاں کئی ایک اشعار ایسے ہیں جن میں سائنسی اصول راست یا بالواسطہ طور پر موجود ہیں۔

ابتدا میں یہ خیال تھا کہ ''سائنس اور غالبؔ'' کے زیرِ عنوان ایک مقالہ لکھا جائے، جس میں غالبؔ کے اشعار میں پائی جانے والی سائنسی حقیقتوں کا احاطہ ہو۔ جب اس مقالے کے سلسلے میں ہم نے چند ادیب، شاعر اور ادب دوست، احباب سے تذکرہ کیا تو ملا جلا ردِعمل پایا۔ اکثر نے اس فکر و تجسس کو سراہا۔ چند ایک نے سائنس اور غالبؔ کے تعلق کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان تاثرات نے ہمیں مجبور کیا کہ غالبؔ پر لکھی گئی زیادہ سے زیادہ کتابیں اور دیوانِ غالبؔ کی ان تمام شرحوں سے استفادہ کریں جو ہماری دسترس میں تھے تاکہ دیگر تمام شارحین کی رائے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جان سکیں کہ غالبؔ کو سائنس کی آگہی کس طرح حاصل ہوئی تھی۔ اس دوران ہم نے دیکھا کہ عصری علوم سے واقف بیشتر شارحین نے جو مفاہیم و مطالب پیش کئے وہ ہمارے پیش کردہ سائنسی اصولوں سے قریب قریب اتفاق کرتے ہیں۔ اس ورق گردانی میں ہمیں غالبؔ کے کئی ایک ایسے اشعار کا پتہ بھی چلا جن میں سائنسی رموز پائے جاتے ہیں اور ہماری توجہ ان کی جانب مبذول نہیں ہوئی تھی۔

شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے اکثر صاحبین سائنسی امور کے جاننے کو ایک گمبھیر مسئلہ سمجھتے ہیں، بلکہ شجرِ ممنوعہ کی طرح اس سے دور بھاگتے ہیں۔ جب کہ سائنس حسن، حقیقت اور صداقت کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ یوں تو سائنس لاطینی لفظ SCIENTIA سے ماخوذ ہے، جس کے لفظی معنی 'علم' کے ہوتے ہیں۔ فلاسفر، مفکرین و ماہرین سائنس نے اس کے مفہوم کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ افلاطون کہتا ہے :

''سائنس ادراک کے سوائے کچھ نہیں ہے''

سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے مفہوم میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ سائنس کا مفہوم چاہے کچھ بھی ہو، لیکن حقیقتاً یہ فطرت کا مطالعہ ہے جس میں مشاہدات اور تجربات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ تجسس

انسانی جبلت میں شامل ہے جو اس کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ فطرت میں وقوع پذیر ہونے والے عوامل کو جانے، سمجھے اور ان کی حقیقت کو پہچانے۔ علاوہ اس کے سائنس کا جاننا انسان کا فطری عمل ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ نظریات اور کلیات پر مشتمل کتابوں کا مطالعہ کیا جائے نہ کہ عملی طور پر تجربات انجام دیئے جائیں۔

فطرت میں رونما ہونے والے واقعات، مناظر کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بنی نوع انسان جب ان پر گہری نظر ڈالتا ہے تو اس کے سامنے کئی ایک سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جب وہ ان سوالات کے جواب ڈھونڈ نکالتا ہے تو گویا وہ ان کی حقیقت کو پالیتا ہے۔ اسی حقیقت کو جب ایک سائنس داں جان لیتا ہے تو وہ اس کے لئے نظریات اور کلیات کی تدوین کرتا ہے جو سائنس کے میدان میں ایک لمبی جست لگانے کے مترادف ہوتا ہے، جس کو عام زبان میں سائنس کی ترقی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی ایجاد و اختراع کا ظہور ہوتا ہے یا کوئی تکنیک رواج پاتی ہے تو ایک نیا نظام عالم وجود میں آتا ہے جو ہمارے کام کرنے کی صلاحیت اور مشکلات سے نمٹنے کی قابلیت میں اضافہ کرتے ہوئے ہمارے لئے مختلف سہولتوں کی فراہمی کا باعث بنتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ایک نئی ٹکنالوجی فروغ پاتی ہے اور ہمارے نظام حیات، رہن سہن، صحت و طبابت، صنعت و حرفت یا ذرائع حمل و نقل، مواصلات اور تفریح و طبع پر راست اثر انداز ہوتی ہے۔

زیر نظر کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب ''غالب کا سائنسی شعور'' میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب کے سائنسی شعور اور سائنس سے ان کی آگہی پر، صاحبانِ علم و دانش کے حوالوں سے تفصیل کے ساتھ گفتگو ہو۔ یہ بات بھی اُجاگر کی گئی ہے کہ غالب اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسند اور جدید ذہن کے حامل تھے۔ مزید یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ آج کے دور کا جدید ذہن اور غالب کے ذہن و فکر کی سطح میں کس حد تک یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ دوسرے باب ''سائنس اور غالب'' میں سائنسی حقائق اور ان کے اشعار کے مضامین میں پائی جانے والی مطابقت کے موازنہ کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرا باب ''غالب کے سائنسی اشعار، ماہرین علم و ادب کی نظر میں'' ہے۔ اس باب میں ان تمام شارحین اور ماہرین علم و فن کے خیالات، مطالب اور مفاہیم کا احاطہ کیا گیا ہے جو انھوں نے غالب کے ان اشعار کے بارے میں پیش کیا ہے جن سے متعلق سائنسی اُمور کے پائے جانے کی سمت نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں کچھ مطالب اور

مفاہیم ایسے ہیں جن میں کھلے عام یہ کہا گیا ہے کہ غالب نے سائنسی اصولوں سے استفادہ کیا ہے۔

میرے دوست مظہر الزماں خاں نے اس کتاب کی اشاعت میں ہر موڑ پر میرا ساتھ دیا، جناب طالب خوندمیری اور جناب ولی تنویر نے میری ہمت افزائی کی اور ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔ میں ان تمام احباب کے اس خلوص کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مشکور ہوں اپنے مخلص دوستوں کا جنھیں اس کتاب کی اشاعت کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ان میں ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال، ڈاکٹر عابد معز، جناب پرویز یداللہ مہدی، جناب مضطر مجاز، پروفیسر یوسف کمال اور جناب کبیر احمد قابل ذکر ہیں۔

میں سپاس گذار ہوں اردو دنیا کے نامور ادیب اور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر وزیر آغا، جناب رشید حسن خاں، پروفیسر حامدی کاشمیری اور علم کیمیاء کے نامور سائنس داں پروفیسر یم تقی خاں کا کہ آپ تمام ہستیوں نے میری کتاب کے مسودے کے مطالعے کی زحمت اُٹھائی اور اپنے زرین خیالات اور آراء سے نوازتے ہوئے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔

ادبی ٹرسٹ اور آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی نے اس کتاب کی اشاعت کے لئے جزوی مالی تعاون فراہم کیا جس کے لئے میں معتمد ادبی ٹرسٹ جناب زاہد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ سیاست، صدر اُردو اکیڈیمی جناب سید شاہ نورالحق قادری اور ڈائرکٹر اُردو اکیڈیمی جناب محمد عبدالمنان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

5 ستمبر 2000ء

ڈاکٹر وہاب قیصر

غالبؔ کا سائنسی شعور

کسی بھی زبان کے بلند پایہ ادیب اور شاعر زمانے کے نبض شناس ہوتے ہیں۔ وہ ماضی اور حال سے واقف، بہتر مستقبل کے نقیب ہوتے ہیں۔ بدلتے ہوئے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی حالات کو تیزی کے ساتھ بھانپ لیتے ہیں۔ ان کی تخلیقات آفاقی، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ جو نہ صرف تخلیق کار کے عہد کی آئینہ دار ہوتی ہیں بلکہ آنے والے عہد پر اثر انداز بھی۔ غالبؔ کی شاعری اپنی مشکل پسندی کے باوصف اس کی ایک بہترین مثال ہے جو اپنی بھرپور معنویت، گہرائی، گیرائی کے لئے شہرت رکھتی ہے۔ شائد اس لئے جس کسی نے بھی ان کے کلام کا مطالعہ کیا اسے اپنی سطحِ ذہنی، مبلغ علم کے مطابق سمجھا اور لطف اندوز ہوا ہے۔

غالبؔ کے شعور کو سمجھنے اور ان کے ذہن کو پڑھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس عہد کی دلی کے ادبی اور علمی ماحول کا جائزہ لیا جائے جس میں ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ گذرا۔ یہ اور بات ہے کہ اس معاملہ میں ان کے ذہنی نشو ونما اور تفکر کا بڑا دخل تھا۔ تاریخی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہر دلی اپنے بسائے جانے کے بعد سے غدر تک علمی مزاج کی حامل رہی جو التمش کی علم دوستی اور معارف پروری کا نتیجہ تھی۔ یہاں تک کہ ایشیاء اور مغربی ایشیاء کے علماء اور فضلاء نے دلی کو اپنی جائے رہائش بنالی تھی۔ اور یہ شہر علم، اہل علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔ ہر عالم کے مکان کو ایک درس گاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مدرسوں کا قیام عمل میں لانا صدقہ جاریہ کا درجہ رکھتا تھا۔ چنانچہ غالبؔ کے عہد تک دلی میں بے شمار مدارس کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ ان مدرسوں کے نصاب میں طبعی سائنس کا غلبہ تھا جو اس دور میں معقولات کے نام سے پڑھائی جاتی تھی۔ اس میں علم طبعیات، ریاضیات، فلکیات اور

عنصریات شامل تھے۔ شہر کے عالم، فاضل حضرات کے مابین سائنسی علوم کے کئی ایک مسائل زیرِ بحث رہا کرتے۔ ماہرین علم و دانش کا خیال ہے کہ غالبؔ اور دلی کے علماء کے مابین سائنسی علوم کے مسائل یقیناً زیرِ گفتگو رہے ہوں گے۔

غالبؔ کے عہد میں ملک کس دور سے گزر رہا تھا اور یورپ کی ترقی کے اس پر کیا اثرات پڑ رہے تھے، اس کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن ''غالب اور عہدِ غالب'' کے زیرِ عنوان اپنے ایک مقالے میں اس طرح رقمطراز ہیں :

> ''غالب کے دور تک آتے آتے ایک طرف تو یورپ عہدِ ظلمت سے نکل کر روشن خیالی کے دور میں داخل ہوچکا تھا، تو دوسری طرف ایشیاء سے اس کے تجارتی تعلقؔ کی اجارہ داری ہندوستان ہی نہیں، ترک ایرانیوں کے ہاتھ سے بھی نکل چکی تھی جو ہند ایرانی تہذیب کی بنیاد تھی۔ اب ان اہلِ حرفہ کی اہمیت نہ تھی جو ڈھاکے کی ململ بنتے اور بیرون ملک برآمد کرتے تھے۔ اب انسان اپنے ہاتھ میں '' عقل اور ارتقاء '' کے نئے ہتھیار کے ذریعہ لامحدود امکانات کو ختم کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔'' (غالب نامہ، جولائی 1981ء ص 133-132)

غالبؔ ایک حساس دل و دماغ کے مالک تھے۔ انھیں اس دور میں پڑھائے جانے والے تمام روائتی علوم اور ان کے ابتدائی اصولوں سے واقفیت حاصل تھی۔ ان علوم میں علم ہیئت، فلکیات، طب اور مابعد الطبیعیات قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مطالعہ میں حقائق اور معارف کی کتابیں شامل رہتیں اور ان علوم پر انھیں دسترس بھی حاصل تھی۔ ''یادگارِ غالب'' میں الطاف حسین حالیؔ لکھتے ہیں :

> ''علم تصوف جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ 'برائے شعر گفتن خوب است' ان کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعہ سے گذرتے تھے اور سچ پوچھئے تو انہی متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف

اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنادیا تھا۔" (ص 56-55)

غالبؔ کے کلام میں ان کی فکری بصیرت کے ساتھ ساتھ منطق، فلسفہ، فلکیات اور جمادات کے اصول صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ملک محمد عنایت اللہ "الہامات غالب" میں ان کی عصری حسیت اور علمی قابلیت کا اعتراف کچھ اس طرح کرتے ہیں :

"مرزا کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں علم مروجہ سے کافی واقفیت تھی۔ منطق، فلسفہ، ہنیت کی علمی مصطلحات ان کے ابتدائی کلام میں پائی جاتی ہیں۔ نیز وہ طب کی مشہور کتب سے بھی بخوبی واقف تھے۔" (ص 10)

مرزا غالبؔ جدید علوم کی نہ صرف آگہی رکھتے تھے بلکہ دوسروں کو ان کے حصول کی تاکید بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے ایک شاگرد میر مہدی حسین مجروحؔ کے بھائی میر سرفراز حسین کے بارے میں جب انھیں پتہ چلا کہ وہ فقہ کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے مجروحؔ کو مئی 1861ء میں اپنے ایک خط میں عقلی علوم حاصل کرنے کی ترغیب دی تھی :

"میاں کس قصّے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و منطق، فلسفہ پڑھ جو آدمی بننا چاہے۔"

(خطوطِ غالب، مالک رام ص 323)

مرزا غالبؔ ایک بیدار مغز، دوربین کی طرح حالات حاضرہ پر نظر رکھتے تھے۔ برِصغیر کے علمی اور ادبی ماحول سے باخبر رہتے تھے جو ان کا خاص وصف تھا۔ اس بارے میں مالک رام "عیارِ غالب" میں لکھتے ہیں :

"وہ باقاعدہ ملک بھر کے اخبار پڑھتا ہے اور اپنے گرد و پیش کے حالات اور واقعات سے باخبر رہنا چاہتا ہے۔ لاہور کی انجمن ہو، یا حیدرآباد میں شعراء کی قدردانی کا واقعہ یا کلکتہ میں کسی نئے افسر کی آمد —— وہ ان سب سے باخبر رہنا چاہتا ہے۔" (ص 267)

غالبؔ 30 سال کی عمر میں دہلی سے کلکتہ جانے کے لئے نکلتے ہیں۔ پہلے لکھنو اور پھر وہاں سے بنارس میں قیام کے بعد کلکتہ پہنچتے ہیں۔ اس طرح وہ کوئی ڈھائی سال کے عرصے تک دلی سے باہر رہتے ہیں۔ جب وہ لوٹتے ہیں تو اس وقت شہر کی علمی اور ادبی فضاء کو مختلف پاتے ہیں۔ اس کے بارے میں ظ-انصاری نے اپنے مقالہ ''غالب اور وفا کا تصور'' میں لکھا ہے :

''غالب 1830ء میں بکھرے ہوئے اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ یہاں انگریزی تعلیم کی شروعات ہے۔ انگریزی علم و دانش کا چرچا ہے اور اس کے خلاف علوم قدیمہ سے وفاداری کا محاذ گرم ہے۔ اُدھر زمین گول ہونے اور زمین کے گھومنے کی خبر گھوم رہی ہے، ادھر مولوی فضل حق خیرآبادی، غالب کے بزرگ دوست 'ابطالہ حرکتہ الارض' تصنیف فرما رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہ مجاہدین کی جماعت میں فدائیوں کی سر و سامان کی اور چندے کی رقموں کی ریل پیل ہے۔ وہ تحریک جس کی موجودہ صورت کو آج کل Fundamental کہا جاتا ہے۔ غالب کے کئی ہم عصر اور ہم سر اس تحریک کے ہمدرد ہیں یا اس تحریک کے ہمنوا ہیں، مثلاً حکیم مومن خاں، اس کے سیاسی پہلو سے ہمدردی، مگر ذہنی اور نظریاتی پہلو سے شدید اختلاف رکھتے ہیں مثلاً مفتی صدر الدین آزردہ، غالب کو مولوی فضل حق اپنے پروپگنڈے کا ہتھیار بنانا چاہتے ہیں، مروت میں غالب پیچھے پیچھے ہولیتے ہیں، لیکن نتیجے میں الٹی بات کہہ جاتے ہیں۔ ڈانٹ سن کر پھر اسے سیدھا کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ دانستہ یا نادانستہ ذہن 'غیر مقلدوں' کی طرف جاتا ہے یا نسبتۂ آزادانہ بھٹکتا ہے۔'' (غالب نامہ، جولائی 1987ء ص 46)

غالبؔ فکر و نظر کی پختگی اور عمل پیہم کو ذی شعور انسان کا معیار اور اختیار تمیزی مانتے تھے۔ جدید علوم اور حقائق کی جانکاری کے لئے ان میں بلا کا تجسس پایا جاتا تھا۔ یہی تجسس ان کی بصارت اور بصیرت کو

پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوا۔ ظ۔ انصاری نے غالب کے منشاء کو واضح کرنے کے لئے ''غالب شناسی ۲'' میں ان الفاظ کا سہارا لیا ہے :

''--- زندگی اور فن کے متعلق غالب تفکر کا قائل ہے۔ علوم میں معقولات Natural Science کی تحصیل پر زور دیتا ہے ، ہر ایک منظر پر آنکھیں کھلی رکھنے اور اس کی تہہ میں اترنے کو ذہین آدمی Intellectual کا فریضہ قرار دیتا ہے ، تاہم اس کا نقطۂ نظر عملی ہے۔'' (ص 10)

مرزا غالب کا دور انیسویں صدی کا دور ہے جب کہ یورپ، سائنس کی ترقی سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ جس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑھنے لگے تھے۔ غالب ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سائنس کی ترقی سے ان کی آگہی اور شعور کی بیداری، ان کے ذہن میں ایک نئے سائنسی دور کا تصور پیش کر رہی تھی۔ حامدی کاشمیری نے ''غالب کے تخلیقی سرچشمے'' میں اس بات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :

''--- انیسویں صدی کی روح ان کی شخصیت میں رچ بس گئی تھی اور اس صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے بین الاقوامی سطح پر سائنس اور فکر و فلسفہ کی ہمہ جہت ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی شعور ، ہمہ گیری اور پھیلاؤ کے جن نئے امکانات سے روشناس ہوا ، غالب انگریزی سے ناواقفیت کے باوجود ان کا وجدانی ادراک رکھتے تھے۔ اُن کا خلّاق اور متجسس ذہن زندگی کے مستور گوشوں کی نقاب کشائی کے لئے مضطرب رہتا تھا۔ وہ خود میں ڈوب کر سراغ پانا چاہتے تھے۔ اُن کے شعور میں کائناتی پھیلاؤ تھا۔ انھوں نے انفرادی تجربہ ، تاثیر اور تجسس کی بدولت مختلف مسائل سے آگہی پائی تھی۔ انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ نئے سائنسی دور میں ایک نئے انسان کی تخلیق ہورہی ہے۔'' (ص 135)

ایک اور مقام پر وہ لکھتے ہیں :

"انگریزی تہذیب و تعلیم کے رواج نے اور ساتھ ہی پریس کی ایجاد نے ملک میں روشن خیالی کی فضاء قائم کررکھی تھی۔ دلی میں خاص طور پر دلی کالج کا قیام روشن فکری کی ایک زندہ علامت بن گیا تھا اور پھر وہاں سائنس ، فلسفہ اور ریاضیات کے جدید علوم کی اشاعت سے روشنی کی لہریں پھیلتی رہیں جو غالب کے دل و دماغ تک بھی پہنچتی رہیں۔ وہ قدیم علوم کی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس رکھتے تھے اور نئے دور میں ان کی عملی رفاقت سے مایوس تھے۔ وہ جدید علوم کی افادیت سے باخبر تھے --- "(ص 125)

دہلی کالج کے قیام سے شہر کے پڑھے لکھے لوگوں پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور وہاں کی علمی و ادبی فضاء میں کیا تبدیلی رونما ہوئی ، اس بات کا اندازہ یوسف حسین خان کی اس تحریر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے :

"دہلی کالج کے قیام سے مغربی سائنس کے علمی اصول کا عام طور پر چرچا ہونے لگا۔ اردو زبان کی نئی نئی صحافت نے بھی اس کام میں ہاتھ بٹایا۔ اس کالج میں چوں کہ سائنس اور ریاضی کی تعلیم پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا اور ان علوم کے ترجمے اور تالیفات اردو میں شائع کی گئی تھیں ، اس لئے مغربی علوم کے تصورات سے پڑھے لکھے لوگ آگاہ ہونے لگے۔ مثلاً مومن خاں اپنے مذہبی عقائد میں بڑی شدت رکھتے تھے اور اہل حدیث کی تحریک سے ، جس کے قائد سید احمد بریلوی تھے ، ان کا گہرا تعلق تھا لیکن بائں ہمہ انھوں نے اپنے ایک شعر میں آسمان کی گردش کی بجائے جسے عام طور پر فارسی اور اردو کے شاعر باندھا کرتے تھے ، زمین کی گردش کے تصور

کو شاعرانہ آب و رنگ کے ساتھ پیش کیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دہلی کالج کا پڑھے لکھے لوگوں پر کیا اثر ہوا تھا۔'' (غالب اور آہنگ غالب ص 32-31)

غالب ہی کے دور میں سرسید احمد خاں ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک نئی سمت اور نئی روشنی سے واقف کروانا چاہتی تھی۔ سرسید نے فرسودہ علوم اور اس کی درس و تدریس پر سائنس، علوم جدیدہ اور انگریزی ذریعہ تعلیم کو ترجیح دی تھی۔ انھوں نے اکبر اعظم کے وزیر ابوالفضل کی فارسی میں لکھی ہوئی ''آئین اکبری'' کی جلدوں کی تصحیح کی اور ان میں جہاں کہیں بھی خامیاں اور کوتاہیاں رہ گئیں تھیں، کافی جانفشانی کے ساتھ تحقیق کر کے انھیں دور کیا اور اس کو نئے ڈھنگ سے ترتیب دیا تھا۔ سرسید نے جب مرزا غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی خواہش کی تو انھوں نے باوجود اس کے کہ سرسید ان کے اچھے دوست تھے، ان کے اس کام کو قدامت پسندی اور مردہ پرستی سے تعبیر کیا۔ ''آئین اکبری'' پر غالب نے فارسی مثنوی پر مشتمل تقریظ لکھی جس میں انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ ابوالفضل کی کتاب اس قابل نہ تھی کہ اُس کی تصحیح میں اس قدر عرق ریزی اور جانفشانی کی ضرورت تھی۔ مزید انھوں نے انگریزوں کو اکبر اور ابوالفضل کے مقابلے میں تعریف کے قابل قرار دیا جو نئے آئین، ایجاد اور اختراع لے کر آئے تھے۔ مضطر مجاز کے کئے گئے تقریظ کے اس حصے کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جس میں انگریزوں کی ایجادات کی تعریف کی گئی ہے۔

اہل انگلستان کو تو دیکھئے — شیوہ و انداز ان کے بوجھئے
کیسے یہ آئین لے کر آئے ہیں — جو نہ دیکھا آج تک دکھلائے ہیں
ان ہنرمندوں نے چمکایا ہنر — اپنے پرکھوں سے ہیں آگے بیش تر
داد و دانش کو ملایا، دیکھ تو! — نت نئے آئین دیئے ہیں ہند کو
آگ پیدا ہوتی ہے جو سنگ سے — کس طرح وہ خس سے لے کر آگئے
پڑھ کے کیا پھونکا انھوں نے آب پر — ہیں دخانی کشتیاں مست سفر
بھاپ سے کشتی کو جیحوں میں چلائیں — اور کبھی پہیوں کو صحرا میں گھمائیں
بھاپ کی قوت سے پہیہ گھوم جائے — طاقت اسپ و گاو نر کی مات کھائے
بھاپ سے کشتی میں رفتار آگئی — رہ گئے منہ تکتے باد و موج بھی!

ساز میں بے زخمہ وہ نغمے جگائیں	طائروں کی طرح حرفوں کو اڑائیں
ہاں ! یہ مردانِ خردمند ایسے ہیں	پل دو پل میں حرف میلوں بھیج دیں
آگ یوں دکھلاتے ہیں وہ باد کو	مثلِ اخگر بس ! چمک اٹھتی ہے وہ
دیکھ جاکر لندنِ رخشندہ باغ	ہے وہ سارا شہر روشن بے چراغ
ہوش مندوں کے ہیں ایسے کاروبار	ہیں ہر ایک آئین میں آئین ہزار !

(مرزا غالب، نتالیا پری گارنا، ترجمہ اُسامہ فاروقی ص 200-199)

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالبؔ جدید رجحانات کو قبول کرنے کے معاملہ میں سر سید سے بھی آگے تھے۔ اسی بات کا اظہار خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی کتاب ''افکارِ غالب'' میں کچھ اس طرح کیا ہے :

"--- لوگ سر سید کو نئے زاویہ نگاہ کا امام سمجھتے ہیں۔ لیکن غالب اس حیثیت میں سر سید سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ اگرچہ اس نے کوئی عملی اقدام نہیں کیا اور نئے اثرات کے ماتحت اپنی شاعری کا رخ بھی نہیں بدلا ۔ لیکن سرسید کی آئین اکبری کی تصحیح پر اس نے تقریظ میں جو اشعار کہے ہیں وہ اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ وہ تہذیب و تمدن کے نئے آئینوں کو قابل ترجیح خیال کرتا تھا اور اس بات کی تلقین کرتا تھا کہ اب نئے انداز حیات کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور قدامت پرستی کے جذبے کو خیرباد کرکے پوری توجہ نئی زندگی پر مبذول کی جائے ۔ لوگوں نے سر سید کی مخالفت زور و شور سے اس لئے کی کہ وہ قوم کو قدیم سے جدید کی طرف لانا چاہتا ہے ۔ اور انگریزوں اور انگریزیت سے مغلوب ہو گیا ہے ۔ لیکن غالب ، سر سید کی مخالفت اس لئے کرتا ہے کہ قدامت پرستی کے خبط میں مردہ پرستی کررہا ہے ۔ اس تقریظ سے غالب کی آزاد خیالی اور ترقی پسندی کا ثبوت ملتا ہے ---"(ص 13-12)

اس کے برخلاف یوسف حسین خاں نے اپنی کتاب ''غالب اور آہنگ غالب'' میں غالب اور سر سید

دونوں ہی کو جدید ذہن کے حامل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

”غالب اور سید احمد خاں دونوں ہی جدید ذہن رکھتے تھے۔ دونوں چاہتے تھے کہ مغربی علوم و تہذیب سے خود اہل ملک کی زندگی کو ترقی کی راہ پر ڈالیں۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنے اپنے رنگ میں ہماری ذہنی اور اجتماعی زندگی پر گہرے اور دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ غالب نے اپنی اردو نظم و نثر کی جدت سے اور سید احمد خاں نے اپنی اصلاحی منصبوں کے ذریعے سے۔ دونوں ان انقلابی تبدیلیوں کے ہر اول ثابت ہوئے جو جلد پیدا ہونے والی تھیں۔ دونوں کا ذہن تخلیقی تھا۔ دونوں صاحب نظر تھے، دونوں کے کارناموں کا اثر ہم آج تک محسوس کر رہے ہیں۔ دونوں نے انگریزی زبان سے ناواقف ہونے پر بھی مغربی تہذیب و تمدن کو ایسا صحیح سمجھا کہ بہت کم ہندوستانی اہل فکر نے اب تک سمجھا ہے۔ دونوں کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کی اہمیت کو محسوس کرنے کے ساتھ اپنی تہذیب کو اس کے عالم گیر عناصر سے مالا مال کیا۔ دونوں ہماری قومی زندگی کے محسن ہیں۔ دونوں کا شمار انیسویں صدی کی ہندوستان کی عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے۔“ (ص 89-88)

بیسویں صدی میں کئی ایک صاحبانِ دانش و بینش نے اپنے اپنے طور پر کلامِ غالب کی شرح کی اور ایک ہی شعر کے کئی کئی مطالب نکالے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ غالب کے کلام کی وسعت میں کس قدر بے کرانی ہے۔ جب ہم غالب کے کلام کو سائنسی نقطۂ نظر سے پڑھتے ہیں تو عقل حیران اور ششدر رہ جاتی ہے۔ ان کے کئی ایک اشعار میں ہمیں مختلف سائنسی اصول اور ان کے معنی خیز نتائج و حقائق کی پردہ دری نظر آتی ہے۔ چنانچہ اسلوب احمد انصاری ”نقشِ غالب“ میں یوں رقمطراز ہیں :

”--- غالب کے لئے کائنات اور اس کے تمام مظاہر توانائی سے

چھلک رہے ہیں ۔ اشیاء عالم جامد اور ساکن نہیں بلکہ رواں اور مضطرب ہیں ۔ غالب کے نزدیک تکوین کائنات کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا ، اور چوں کہ نمو اور تبدیلی فطرت کا قانون ہے ، اس لئے اولین مادّے کی مختلف ہئیتیں اور ترکیبیں ارتقاء کے ہر ہر مرحلے پر ابھرتی ہیں ۔ غالب کا خیال تھا کہ اگر ذرّے کا دل چیر کر دیکھیں تو وہ حرکت و حیات سے لبریز نظر آئے گا ۔" (ص 63)

اکیسویں صدی کی شروعات پر، جب کہ انسان چاند اور سیاروں پر کمندیں ڈال چکا ہے، غالب کی آفاقی فکر ونظر پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ غالب نے اس کائنات کو اور اس کی وسعتوں کو کن کن زاویوں سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ "تفہیمِ غالب" میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں :

"--- جدید علم الافلاک کی رو سے کائنات لامتناہی ہے یا کم سے کم اتنی وسیع ہے کہ بڑی بڑی کہکشائیں اور عظیم الشان ستاروں کے جھرمٹ اس میں گم ہیں ، یعنی وہ ایک دوسرے سے اتنی دور ہیں کہ اکثر کے درمیان کا فاصلہ انسان کے تصور سے بھی ماورا ہے ۔ غالب کے زمانے میں یہ دریافتیں ابھی کتم عدم میں تھیں ، لیکن ان کے وہبی وجدانی علم نے حسب معمول ان حقائق تک رسائی حاصل کرلی جو ابھی کسی کی دسترس میں نہ تھے ---" (ص 269)

شبلی بی کام نے احمد الدین احمد مارہروی کے ایک مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے ہفتہ وار "خیام" لاہور کے ایک شمارے میں "کیا غالب سائنس دان تھا" کے زیرِ عنوان کچھ اس طرح اظہار خیال کیا ہے :

" مرزا غالب اپنے زمانے کا فقیدالمثال شاعر تھا ۔ لیکن اب اُسے "فلسفی" اور "سائنس دان" بھی ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ پچھلے دنوں ایک صاحب احمد الدین احمد

مارہروی کا ایک مضمون نظر سے گزرا۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ مرزا غالبؔ کو نہ صرف علم طبیعیات، علم کیمیاء اور علم الافلاك میں دسترس تھی بلکه وہ اپنے زمانے کے اکتشافات سے بھی آگاہ تھا۔ چنانچه ذیل کا شعر ملاحظه فرمائیے ؎

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا　　ہر روز دکھاتا ہوں میں ایک داغ نہاں اور

اس شعر سے یه ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا غالبؔ کو ذیل کے امور سے آگاہی تھی۔ (1) سورج میں داغ ہوتے ہیں (2) یہ داغ ہمیشه تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی کبھی زیادہ ہوتے ہیں کبھی کم (3) داغ نه صرف گردش کے باعث تبدیل ہوتے ہیں بلکه اندرونی اسباب کی وجه سے بھی ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ "داغ نہاں" کا اشارہ اسی طرف ہے---"

(ہفتہ وار خیام لاہور، 8 جولائی 1944ء ص 7)

ٹی وی، کمپیوٹر اور انٹرنٹ کے اس دور میں شعر و ادب کے قاری میں سائنس سے واقفیت اور شعور کی بیداری کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان کی سطحِ ذہنی، غالب کے ذہنی شعور کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تب ہی تو دورِ حاضر میں غالب کا کلام جتنا پڑھا، سمجھا اور برتا گیا ہے اور اس کی جتنی پذیرائی ہو پائی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ (اتنی پذیرائی غالب کے دور میں بھی ہو نہ سکی تھی) نورالحسن نقوی نے "دیوانِ غالب" میں ان کے کلام سے متعلق کچھ اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے :

"غالب کے کلام میں ہر زمانے میں اور ہر ذوق کی تسکین کا سامان موجود ہے۔ ان کی شاعری طرز احساس اور پیرایه اظہار دونوں کے لحاظ سے جدید ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ آنے والے زمانے کے لئے ان کا کلام ممکن ہے آج سے بھی زیادہ پر کشش ہو---" (ص 39)

وزیر آغا نے غالب کی شاعری سے جدید ذہن کے متاثر ہونے کے اسباب کو یوں بیان کیا ہے

"غالب دراصل بیسویں صدی کا انسان تھا جو غلطی سے

انیسویں صدی میں پیدا ہوگیا اور اس بات کی اسے سزا بھی ملی۔ اس کی شاعری مہمل ، اس کے انداز فکر کو نامانوس اور اس کے اسلوب حیات کو قابل اعتراض قرار دیا گیا۔ مگر جب غالب تقریباً ایک سو برس کی مسافت طے کرنے کے بعد اپنوں میں پہنچا تو زمانے نے بانہیں کھول کر اس کا استقبال کیا ---" (رسالہ اوراق دوماہی لاہور شمارہ مئی جون 1983ء ص 235)

آگے وہ مزید لکھتے ہیں :

"--- غالب کی شاعری جدید ذہن کو اس لئے عزیز ہے کہ اُس میں اسے اپنی یافت اور نایافت ، انفرادیت اور اجتماعیت ، ذہنی فعالیت اور تخلیقی اپج ایک ایسے احساس بحر آسا پر منتج ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو بعض اوقات تو کائناتی شعور کے مقام تک بھی جا پہنچتی ہے۔"

(رسالہ اوراق دوماہی لاہور شمارہ مئی جون 1983ء ص 236)

غالب کی شاعری میں عصرِ حاضر کے ذہنوں کو متاثر کرنے کے جو امکانات پائے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں آفتاب احمد نے مقتدرہ قومی زبان کے غالبیات پر منعقدہ مذاکرہ میں صدارت کرتے ہوئے کہا تھا :

"--- یہ ضروری نہیں کہ بیسویں صدی کے تنقیدی شعور نے ان کو پورے طور پر پہچان لیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں کوئی اور مضمون پیدا ہو ، کوئی اور کیفیتیں مزاج کی رونما ہوں۔ تو اس کے بعد غالب کے اسی مختصر سے دیوان میں سے بہت کچھ اور نکلے۔" (اخبار اردو اسلام آباد فروری 1998ء)

اس مرحلہ پر اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ غالب کی شاعری صرف بیسویں اور اکیسویں صدی کے لئے نہیں ہے بلکہ آنے والے ہر زمانے کے لئے اتنی ہی اہمیت کی حامل رہے گی۔ ان کے کلام میں اتنی تازگی و تنوع ہے کہ وہ ہر دور کے لئے یکساں طور پر قابل قبول ہوگا۔ اسی بات کا تذکرہ مجنوں

گورکھپوری نے ''غالب، شخص اور شاعر'' میں کیا خوبصورت انداز میں کیا ہے :

''وہ اپنے زمانے کے لئے نیا ذہن تھے ۔ آج بھی ہم ان کو ایک نیا ذہن پاتے ہیں اور ہر اس آنے والے دور کے لئے وہ نیا ذہن رہیں گے جس کا تصور کیا جاسکے ۔ اسی لئے ہر نئے دور کا جدید سے جدید ذہن اپنے کو غالب سے قریب اور مانوس پاتا رہا ہے اور غالب کا انداز فکر اور شیوہ گفتار اس کی تخلیقی قوت کو متحرك کرتا رہتا ہے ۔ غالب ایک ایسا سرچشمہ الہام ہیں جو کبھی ختم ہوسکے گا نہ اپنی طراوت اور تازگی کھوسکتا ہے ۔ ان کی نوائے آشفتہ ''نوائے سروش'' ہے جو ہر زمانے میں سنی جانے گی اور جو ہر نسل کے توانا اور صالح نوجوانوں کو زندگی اور توانائی کا نیا پیغام دینا سکھائے گی ۔'' (ص 121)

آگے وہ مزید لکھتے ہیں :

''غالب پر بہت کچھ کہا اور لکھا جاچکا ہے اور ابھی بہت اور کہا اور لکھا جائے گا ، اس لئے کہ غالب کے اشعار جب ازسرنو پڑھے جائیں گے تو ان کا ہر شعر ایک نئے انکشاف کی مسرت بخشے گا ---'' (ص 125)

آج کے اس ترقی یافتہ سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں اردو شعر و ادب کا قاری جہاں غالب کی شاعری اور ان کی فکر ونظر سے متاثر ہوا ہے وہیں دوسری زبانوں کے لوگ بھی غالب کی غزل اور اس کی آفاقیت کے قائل نظر آتے ہیں ۔ یہاں تک کہ بیرونی ممالک کا باشعور پڑھا لکھا طبقہ بھی غالب سے بڑی حد تک واقف اور متاثر ہے ۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے اپنے مقالے ''عہد جدید میں غالب کی مقبولیت کے اسباب'' کے زیر عنوان اس حقیقت کو پیش کیا ہے :

''--- عہد جدید میں غالب نے بیرون ملک بھی ذہنوں کو متاثر کیا ہے اور اس اثر اندازی کے اسباب غالب کی شخصیت اور شاعری ہی کی طرح مختلف بلکہ متضاد ہیں ۔ روسی نقاد

غالب کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں سماجی شعور، عوام دوستی اور سامراج دشمنی میں اپنے معاصروں سے آگے پاتے ہیں۔ جدید امریکی شاعرہ ایڈرین رچ کو جب غالب کی کچھ غزلوں کے انگریزی ترجمے دیئے گئے تو اُسے ان غزلوں میں خیال کے ارتکاز اور ہمہ گیری کی بہ یک وقت موجودگی نے حیران کردیا۔ اُس نے ان اشعار کے مضامین کو انگریزی میں نظم کیا اور اعتراف کیا کہ غالبؔ کے شعروں کو انگریزی نظم کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اُسے ایسے واضح نقوش اور پیکر تیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جن کے پیچھے پرچھائیوں، بازگشتوں اور عکس در عکس کا ایک سلسلہ موجود ہو، اور ان نظموں کا اجمال اور چستی مغربی قارئین کو جاپانی ہائیکو، یا الگزنڈر پوپ یا یونانی شاعری کی بیتوں کے اجمال اور چستی سے بالکل مختلف محسوس ہوئی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عہد جدید میں غالب کی مقبولیت نے اپنے لئے نئے میدان تلاش کرلئے ہیں اور آئندہ زمانوں میں بھی غالب کا انتظار کررہی ہے۔" (مجلّہ غالب نامہ جولائی 1987ء ص 65-64)

سائنسی علوم کی روشنی میں غالبؔ کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کے ہاں کئی ایک شعار ایسے ہیں جن میں علم حیاتیات، طبیعیات، کیمیاء، فلکیات، طب اور ماحولیات کے مختلف جامع و نع اصول صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ علم فلکیات پر مشتمل چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ستاروں اور یاروں کی حقیقت کو بڑے ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ہیں زوال آمادہ اجزائے آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

عام آدمی کے لئے علم طبیعیات اور اس کے اصولوں کو سمجھنا ایک دشوار امر ہے۔ غالب نے انھیں،

اشعار میں اتنی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ہم اُن سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔

نہ گل نغمہ ہوں ، نہ پردۂ ساز | میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں | تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی (ق) | باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
یک قلمِ کاغذِ آتش زدہ صفحۂ دشت | نقشِ پا میں ہے تپِ گرمئ رفتار ہنوز
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی | چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا | ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب | ذرّے اس کے گھر کی دیواروں میں نہیں

طبعی اور کیمیائی تبدیلی کے رونما ہونے کا تذکرہ کتنے دلکش انداز میں کیا گیا ہے ۔

ضعف سے گریہ مبدّل بدمِ سرد ہوا | باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں | خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم | تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیئے

غالب کو علم حیاتیات سے آگہی تھی ۔ اس بات کی تصدیق ان اشعار سے ہوتی ہے ۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں | ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی | بن گیا روئے آب پر کائی
بس کہ زیرِ خاک ، با آب طراوت راہ ہے | ریشہ سے ہر تخم کا ، دلو اندرون چاہ ہے
کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد ! | مَے ہے یہ ، مگس کی قئے نہیں ہے

علم طب سے واقفیت اور اس سے ان کے لگاؤ نے ان موضوعات کو شعری پیرہن عطا کرنے کا باعث بنا ۔

کیا کہوں بیمارئ غم کی فراغت کا بیان | جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ | کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے
اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا | آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں | ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتشبار ہے
جلتا ہے دل کیوں نہ ہم ایک بار جل گئے | اے ناتمامئ نفس شعلہ بار حیف

نہ پوچھ نسخۂ مرہم ، جراحتِ دل کا	کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

ارضیات اور ماحولیات کے اصول ان اشعار میں صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں ۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے	عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا	بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم	صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

اس طرح اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ غالب حقائق و معارف کے ساتھ ساتھ سائنس کا فہم و ادراک رکھتے تھے ۔ ان کے ہاں سائنسی شعور اور سائنس کی آگاہی اس قدر پائی جاتی تھی کہ وہ اپنی شاعری میں اس کے اصولوں سے استفادہ کیے بغیر نہ رہ سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ عہد کا جدید ذہن، دوسرے کلاسیکی شاعروں کی بہ نسبت، غالب کو اپنے ذہن سے بہت قریب پاتا ہے ۔

سائنس اور غالبؔ

مرزا غالبؔ اردو ادب میں ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شاعری میں ان کی عظمت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ان کا کلام پچھلے ڈیڑھ سو برس سے پڑھا جا رہا ہے۔ اردو کے علاوہ دنیا کی کئی زبانوں کے بیشتر نثر نگار اپنے اپنے فہم و ادراک کے مطابق ان کی شخصیت اور ان کے فن پر اظہار خیال کر چکے ہیں۔ سینکڑوں مقالے لکھے جا چکے ہیں، بیسیوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان گنت ماہرین علم و فن نے ان کے اعلیٰ تخیئل، تفکر اور فن کو تسلیم کیا۔ ان کے طرز و اسلوب، استعارہ، کنایہ و تمثیل کے برمحل استعمال کو سراہا اور ان کی شاعری کو فلسفیانہ، حکیمانہ، صوفیانہ، عاشقانہ، شوخیانہ اور ظریفانہ قرار دیا۔ ان کی محققانہ نظر، حقیقت پسندی اور راست گوئی کے قائل ہوئے۔ آل احمد سرور، غالبؔ کے کلام کی وسعت اور بے کرانی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ”غالبؔ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب بھی لکھا جا رہا ہے اور شائد آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ اس قدر تحقیق و تنقید کے بعد بھی نئے نئے پہلو روز سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور ان کی روشنی میں غالبؔ کے بہت سے بُت ٹوٹتے اور بنتے ہیں۔ مگر موضوع ابھی فرسودہ نہیں ہے۔ اس میں ایک ابدی تازگی ہے۔ ایک ترشے ہوئے ہیرے کی طرح اس میں سینکڑوں پہلو ہیں۔“ (بین الاقوامی سمینار 1969، مرتبہ یوسف حسین خاں، ص 317)

اس طرح غالبؔ کے کلام میں جس ابدی تازگی کی طرف نشاندہی کی گئی ہے اس کا یہ بین ثبوت ہے کہ آج ہم اس کلام کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ کہنے کے موقف میں ہیں کہ غالبؔ سائنسی اصولوں کا فہم و ادراک رکھتے تھے، جس کی وجہ سے ان کے کلام میں نئی جہتیں اور نئے اعلائم تلاش کئے جا سکے۔

اکیسویں صدی میں داخل ہونے تک سائنس اور ٹکنالوجی نے جو ترقی کی ہے، وہ دراصل ان خوابوں کی تعبیر ہے جنھیں انسان برسہا برس سے دیکھتا آرہا ہے۔ ہزاروں میل تک آواز اور متحرک تصویروں کی ترسیل نے توانائی کی طرح انسانوں کی جسمانی لحاظ سے ناقابل یقین ترسیل کے امکانات پیدا کردیئے ہیں۔ نیز اعضائے جسمانی کے آپریشن اور ان کی کامیاب پیوندکاری نے ان کے نعم البدل ایجاد کرنے کے لئے راہیں ہموار کی ہیں۔ کمپیوٹر، روبوٹ اور انٹرنٹ کی ایجاد، خلاء اور چاند کی تسخیر کے بعد دوسرے سیاروں کی طرف بڑھتے ہوئے انسانی قدم سالہا سال کی تمناؤں کے پورا ہونے کا ثبوت ہیں۔ اس منزل پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنسی علوم کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے محققین اکثر ایسی دریافتوں اور ایجادات کے لئے کوشاں رہتے ہیں، جو دائرہ امکانات سے باہر سمجھی جاتی رہی ہیں۔ غالبؔ کا یہ شعر اسی بات کی عکاسی کرتا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ اِمکاں کو ایک نقشِ پا پایا

سائنسی تحقیقات دو طرح کے مطالعے سے روبہ عمل لائی جاتی ہیں جنھیں اجمالی مطالعہ (Macroscopic Study) اور خورد بینی مطالعہ (Microscopic Study) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اجمالی مطالعہ ہئیت کی تحقیق کا احاطہ کرتا ہے، جس میں کسی نظام یا شئے کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔ خورد بینی مطالعہ میں ماہئیت کی تحقیق کی جاتی ہے۔ اس میں کسی نظام یا شئے کی سالماتی اساس پر تفصیلی تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ سائنس میں اجمالی مطالعہ کو بہ آسانی انجام دیا جاسکتا ہے، جب کہ خورد بینی مطالعہ کے لئے عصری آلات پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ عصری سہولتوں کی عدم دستیابی کی صورت میں اجمالی مطالعہ ہی کافی ہوتا ہے۔ غالبؔ نے بھی اسی بات کا مشورہ دیا ہے۔

نہیں گر، سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

قرآن میں جن آسمانوں کا ذکر آیا ہے، وہ کہیں دور واقع ہوں گے۔ اتنی دور کہ ہم ان کی دوری کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ جو آسمان ہمیں دکھائی دیتا ہے، وہ زمین کو گھیرا ہوا فضائی غلاف ہے۔ اگر ہمیں راست اپنی آنکھوں سے بلند ترین مقام کا نظارہ کرنا ہو تو ہم صرف آسمان ہی کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے آسمان ہی ہمارے لئے بلند ترین حدِ نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں اعظم ترین بلندی کے لئے Sky is the Limit کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔ دوربین استعمال کئے بغیر آسمان سے بلند کسی مقام کا نظارہ مقصود ہو تو ہمیں فضاء سے اونچا اٹھنا ہوگا۔ اسی بات کا اظہار غالبؔ نے حسرت بھرے انداز میں یوں کیا ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

رات میں آسمان پر جھل ملانے والے بے شمار تارے ظاہری جسامت اور روشنی میں اصل سے مختلف نظر آتے ہیں۔ سادہ آنکھ سے دیکھنے پر اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں کون سے ستارے ہیں اور کون سے سیارے۔ چند ستارے بہت دھندلے نظر آتے ہیں اور چند سیارے اتنے منور دکھائی دیتے ہیں کہ ہم انھیں ستارے سمجھ بیٹھتے ہیں۔

Delta ایک ایسا ستارہ ہے جس کی روشنی مستقل نہیں رہتی، اور یہ سیارہ جیسا نظر آتا ہے۔ Cepheids ایسے ستارے ہیں، جو جسامت میں پھیلتے اور سکڑتے رہتے ہیں اور دیکھنے میں وہ سیارے جیسے لگتے ہیں۔

سیارہ مشتری (Jupiter) اور سیارہ زہرہ (Venus) اتنے زیادہ منور نظر آتے ہیں کہ ان پر ستاروں کا گمان ہوتا ہے۔ سیارہ مریخ (Mars) اور سیارہ زحل (Saturn) میں ستاروں جیسی چمک نظر آتی ہے۔ غالبؔ نے ستاروں اور سیاروں کے مختلف نظر آنے کا اظہار کچھ اس انداز میں کیا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

کہکشاں میں گیس اور گرد کے بادل پائے جاتے ہیں، جو نیبولا (Nebulae) کہلاتے ہیں۔ نیبولا میں سب سے زیادہ ہائیڈروجن گیس پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ خفیف مقدار میں کاربن اور سلیکن کے ذرات بھی گرد کی شکل میں موجود رہتے ہیں۔ گیس کے سالمات اور گرد کے ذرات کے درمیان ان کی کمیتوں کی بنا پر تجاذبی کشش (Gravitational Attraction) پیدا ہوتی ہے۔ یہ کشش انھیں ایک دوسرے سے قریب لانے کا موجب بنتی ہے۔ جوں جوں وہ قریب آتے جاتے ہیں ان کے درمیان عمل کرنے والی قوتِ کشش میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جب وہ کافی قریب آجاتے ہیں تو نیبولا کے مرکزی حصے میں دباؤ بڑھنے لگتا ہے، جو تپش کے اضافے کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح سالمات اور ذرات میں پہلے قربت بڑھتی ہے، پھر دباؤ میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے بعد تپش بڑھتی ہے۔ نیبولا میں یہ عمل لاکھوں سال تک جاری رہتا ہے۔

نیبولا کے مرکزی حصے میں دباؤ بڑھ کر جب لاکھوں کرہ ہوائی (Atmospheres) ہوجاتا ہے اور اس کی تپش بھی لاکھوں ڈگری سلسیس تک پہنچ جاتی ہے تو ہائیڈروجن کے مرکزوں میں اتصال (Fusion) واقع ہونا شروع ہوجاتا ہے، جس کے بعد نیبولا ایک ستارہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس طرح کہکشاں میں ایک نئے ستارہ کا جنم ہوتا ہے، جو جگمگاتے ہوئے آسمان کی رونق بڑھاتا ہے۔ غالبؔ نے ستاروں کے بننے کی نشاندہی کچھ اس طرح کی ہے۔

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

کائنات میں تمام ستارے روشنی اور حرارت خارج کرتے رہتے ہیں۔ ان میں یہ توانائی نیوکلیر اتصال (Fusion) سے پیدا ہوتی ہے، جس کے دوران ہائیڈروجن گیس، ہیلیم گیس میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ستاروں کی پیدائش کے لاکھوں کروڑوں سال بعد وہ ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں، جس میں ان کی تمام ہائیڈروجن گیس ختم ہو جاتی ہے اور نیوکلیر اتصال کا عمل رُک جاتا ہے۔ توانائی کی پیداوار کا ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے ستارے اپنی تباہی کی طرف گامزن ہوتے ہیں اور وہ ایک دھماکے کے ساتھ Super Nova میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بعد میں ''سوپر نووا'' بھی تباہ ہوکر یا تو ''نیوٹران اسٹار'' کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، یا پھر روزنِ سیاہ (Black Hole) بن جاتے ہیں۔

مستقبل میں تمام ستاروں کی طرح سورج بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہونے والا ہے۔ جب سورج ہی باقی نہیں رہے گا تو زمین سمیت نظام شمسی کے تمام سیارے اور چاند اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے۔ غالبؔ نے کائنات کی اس حقیقت کو بڑے ہی دلکش انداز میں شعر کا روپ دیا ہے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

علم فلکیات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات میں اربوں کہکشاں ہیں اور Milky Way وہ کہکشاں ہے جس میں آفتاب کے علاوہ لاکھوں ستارے حرارت اور روشنی بکھیرتے رہتے ہیں۔ نظام شمسی میں نو سیارے ہیں اور ہر سیارے کے گرد علاحدہ علاحدہ تعداد میں چاند گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان نو سیاروں کے اطراف گھومنے والے چاندوں کی حقیقی تعداد کا تو علم نہیں، البتہ نظام شمسی میں اب تک 63 چاند دریافت ہو چکے ہیں۔ صرف ایک نظام شمسی میں جب 63 چاند ہو سکتے ہیں تو ہماری کہکشاں میں موجود لاکھوں ستاروں کے نظاموں میں کروڑوں چاند پائے جائیں گے۔ اسی مناسبت سے کائنات کی اربوں کہکشاؤں میں تو بے شمار چاند ہوں گے۔ سونا اور چاندی کے چھلّوں کا سہارا لیتے ہوئے غالبؔ نے کائنات کی ایک حقیقت کو شعری روپ دیا ہے۔

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

کسی شئے کے سالمات مرتعش ہوتے ہیں تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ آواز جو کانوں کو بھلی لگتی ہے، موسیقی کہلاتی ہے۔ موسیقی، سالمات میں باقاعدہ ارتعاش سے پیدا ہوتی ہے۔ گلوکار کی مدھر آواز میں سروں پر مشتمل موسیقیت پائی جاتی ہے۔ طبلہ، ڈھولک، مردنگ وغیرہ موسیقی کے ایسے آلات ہیں، جن میں چرمی جھلیوں کو تانا جاتا ہے۔ انھیں جب پیٹا جاتا ہے تو موسیقی ریز تال پیدا ہوتے ہیں۔

بے سری آواز شور کہلاتی ہے۔ شور اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب سالمات بے قاعدہ طریقہ سے ارتعاش پذیر ہوں۔ شور کانوں پر گراں گذرتا ہے اور ہم اس سے دور بھاگنا چاہتے ہیں۔

جب کوئی شئے ٹوٹتی ہے تو شور جیسی کانوں پر چبھتی ہوئی آواز پیدا ہوتی ہے۔ غالبؔ نے خود کو ایسی ہی آواز سے تعبیر کیا ہے۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

دریا جب بہتا ہے تو اس کا پانی لہروں کی شکل میں رواں دواں ہوتا ہے۔ اس کی روانی کا اندازہ سطح آب پر بہنے والی ہلکی چیزوں کے مشاہدہ سے کیا جاتا ہے۔ بہتے ہوئے پانی کو جب روک دیا جاتا ہے تو تب بھی اس کی سطح پر کسی خلل کی وجہ سے موجیں پیدا ہوتی ہیں۔ ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر جہاں خلل واقع ہوتا ہے وہاں سے موجیں ہر سمت میں نکلتی ہیں اور بڑھتے ہوئے دائروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ خلل کے مقام سے میکانی توانائی موجوں کی شکل میں منتقل ہوتی ہے جب کہ پانی میں کوئی روانی نہیں ہوتی، بلکہ پانی کے سالمات ایک ہی مقام پر اہتزاز کرتے رہتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت پانی پر تیرتی ہوئی ہلکی شئے کی حرکت سے ملتا ہے، جو ایک مقام پر اوپر نیچے اہتزازی حرکت کرتی رہتی ہے۔

کوئی شئے جل رہی ہو تو اس کی آگ بجھانے کے لئے پانی ڈالا جاتا ہے، جو جلتی ہوئی شئے سے حرارت حاصل کر کے بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح جلنے والی شئے کی حرارت میں بہت بڑی کمی واقع ہو کر آگ بجھ جاتی ہے۔

دریا کے بہاؤ کو روکے جانے اور آگ بجھائے جانے کے بعد کی صورتحال کو غالب نے اپنے قطعہ بند میں یوں پیش کیا ہے۔

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجہ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

جب کوئی میکانی کام عمل میں آتا ہے تو حرارت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشینیں چلنے پر گرم ہو جاتی ہیں۔ اسی اصول کے تحت قبائلی لوگ لکڑی پر لکڑی رگڑ کر آگ پیدا کرتے ہیں۔

جب ہم راہ چلتے ہیں تو ہمارے پنجوں سے زمین پر رگڑ پیدا ہوتی ہے، جس کے نتیجہ میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اس حرارت کی مقدار کا انحصار ہماری رفتار پر ہوتا ہے۔ رفتار جتنی تیز ہوگی، حرارت بھی اتنی ہی زیادہ پیدا ہوگی۔ حرارت کے زیادہ پیدا ہونے کی صورت میں راہ میں اُگی گھاس اور کانٹے جل جاتے ہیں اور راستہ بے خار و گیاہ کا ہو جاتا ہے۔ سبزہ زاروں پر پگڈنڈیوں (بٹیا) کا وجود میں آنا اسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سائنس کے اس اصول کو غالبؔ نے کیا خوب نظم کیا ہے۔

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

اور

خار ہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منّتے برقدمِ راہ رادن است مرا

جب کوئی قریبی رشتہ دار گذر جاتے ہیں، مال واسباب چھن جاتے ہیں، کاروبار میں نقصان ہو جاتا ہے، خوشیوں سے محروم کر دیئے جاتے ہیں یا غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے تو درد اور تکلیف کی شدت سے ہم چیخ اُٹھتے ہیں۔

جہاں کہیں بھی آگ ہو، اس میں حرارت کی ایک بڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ حرارت توانائی کی ایک قسم ہے۔ آگ کو چھونے پر جلن کا احساس، حرارتی توانائی کی منتقلی سے ہی ہوتا ہے۔ آگ بجھانے کے لئے جب اس پر پانی ڈالا جاتا ہے تو وہ آگ سے وافر مقدار میں حرارت حاصل کرتا ہے۔ یہ حرارت آنِ واحد میں پانی کو جوش دے کر بھاپ بنانے میں صرف ہوتی ہے۔ اس طرح حرارت کے چھن جانے سے آگ بجھ جاتی ہے اور پانی کے جوش کھانے پر آواز پیدا ہوتی ہے۔ غالب نے اس آواز کو آگ کے نالہ سے تشبیہہ دی ہے۔

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

روشنی کو گذارنے والے مادّے، شفاف واسطے کہلاتے ہیں۔ روشنی کی رفتار کے لحاظ سے شفاف واسطوں کو لطیف اور کثیف واسطوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ وہ شفاف واسطہ جس میں روشنی کی رفتار زیادہ ہو، لطیف واسطہ کہلاتا ہے اور جس میں روشنی کی رفتار کم ہو، کثیف واسطہ کہلاتا ہے۔ واسطوں کی لطافت اور کثافت، اضافی ہوتی ہے۔ ہوا اور پانی میں ہوا لطیف واسطہ ہے اور پانی کثیف۔ پانی اور شیشہ میں پانی لطیف واسطہ ہے اور شیشہ کثیف۔ ہوا اور خلاء لطیف ترین واسطوں میں شمار ہوتے ہیں، اس لئے ان کے آر پار بہت ہی صاف اور شفاف نظر آئے گا۔ ہوا خود نظر نہیں آتی۔ اس کے برخلاف فضاء میں کہر یا دھند چھا جائے تو ہوا کثیف ہو جاتی ہے، جس پر کہر یا دھند تو نظر آتی ہے لیکن اس کے پیچھے کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔ ہوا کی بجائے درمیان میں شیشہ حائل ہو تو شیشے کا نظر آنا اس کی کثافت پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر شیشہ کی دوسری جانب پارہ چڑھا دیا جائے تو وہ آئینے میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس طرح شیشے کے علاوہ منعکس شدہ سارا منظر صاف طور پر دکھائی دے گا۔ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ لطیف واسطے میں جب تک کثافت نہ ہو تب تک وہ نظر نہیں آئے گا۔ اسی بات کا تذکرہ غالبؔ کے ہاں کچھ اس طرح ملتا ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

علم طبیعیات کی شاخ طبعی نوریات (Physical Optics) میں تداخل اور انکسار اصولوں کو سمجھانے کے لئے فرانسیسی سائنس داں Huygen کے پیش کردہ نظریات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ جن کی رو سے روشنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک موجی محاذوں (Wave Fronts) کی شکل میں سفر کرتی ہے اور کسی بھی مقام پر موجی محاذ پر کے تمام نقاط روشنی کے ثانوی ماخذوں کی طرح عمل کرتے ہیں۔ (ٹھہرے ہوئے پانی کی سطح پر کسی خلل کی بنا پر بننے والے دائرے میکانی لہروں کے موجی محاذ کی بہترین مثال ہے۔)

کچے مکانوں میں چھت کے کسی سوراخ سے داخل ہونے والی سورج کی روشنی کا مطالعہ ان نظریات کی روشنی میں کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ چھت کے اوپر پائے جانے والے موجی محاذ کے تمام نقاط چھوٹے چھوٹے سورجوں میں تبدیل ہو چکے ہیں اور سوراخ سے گھر کے اندر جھانک رہے ہیں۔ غالبؔ کا یہ شعر اسی بات کا انکشاف کرتا ہے۔

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

علم طبیعیات کی شاخ نوریات (Optics) میں ایک اصول روشنی کے انکسار سے بحث کی جاتی ہے۔ انکسار سے مراد وہ اصول ہے جس میں روشنی کسی ٹھوس سطح کے کناروں سے مڑتی ہے اور اس کے راستے میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ نتیجتاً اس مقام پر بھی روشنی پہنچ جاتی ہے جہاں ٹھوس کا مکمل سایہ پڑنا چاہیئے۔

اگر کسی ٹھوس سطح کے ایک سوراخ میں کوئی چھوٹی سی شئے اس طرح سما جائے کہ سوراخ کے کناروں اور شئے کے درمیان ایک ہالہ سا بن جائے، تب ایک جانب سے آنے والی روشنی اس ہالہ میں سے گذرتے ہوئے انکسار پذیر ہوتی ہے، جس پر اسی چھوٹی سی شئے کے اطراف دوسری جانب شعاعوں کی ایک پھلجھڑی سی پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ غالبؔ نے سائنس کے اس مظاہر کو تمثیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہرِ آئینہ میں مثلِ ذرّہ روزن میں

سفر کرنے والی تمام جاندار اور بے جان چیزوں اور توانائی کی تمام قسموں میں روشنی کی رفتار اعظم ترین ہوتی ہے۔ وہ ہوا میں ایک لاکھ 86 ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ بجلی کا کوندنا بھی قریب قریب اتنی ہی رفتار سے واقع ہوتا ہے۔ جو پلک جھپکنے تک غائب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیزی سے گذرنے والے لمحے کو بجلی کی کوند سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔

مصیبت میں گذارا ہوا ایک ایک لمحہ بڑا کٹھن ہوتا ہے اور ایک سال کا عرصہ کئی سال کی مدت کا محسوس ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر زمین اور سورج کی باہمی اضافی رفتار کے بجائے بجلی کے کوندنے کے عرصے کو سال مان لیا جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ ہم نے مصیبت کے عالم میں کئی سال گذار دیئے ہیں۔ غالبؔ نے اس موقع کے لئے اسی بات کا مشورہ دیا ہے۔

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

نظریۂ اضافیت کے لحاظ سے کائنات میں وقت کا تعین کرنا ایک اضافی امر ہے۔ تمام سیارے جب اپنے اپنے محوروں اور مداروں پر اپنی ایک گردش مکمل کر لیتے ہیں تو اس گردش کے لئے زمین کے لحاظ سے درکار وقت، ان سیاروں کے لئے ایک دن اور ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اسی طرح زمین کی گردش اس کے اپنے محور پر اور سورج کے اطراف اس کے ایک مکمل چکر لگانے پر دن اور سال کی پیمائش کی جاتی ہے۔ عام آدمی کے لئے سائنس کی یہ حقیقت کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اس کے لئے تو صرف سورج کا طلوع اور غروب ہونا ہی صبح اور شام کا ہونا ہے اور ایک صبح سے دوسری صبح تک کا وقت ایک دن کے مکمل ہونے کا واقعہ ہے۔ موسموں کا بدلنا اور ان کے اثرات کا رونما ہونا، ماہ و سال کے حساب کا پیمانہ ہے۔ غالبؔ نے وقت کی اضافی پیمائش کو پیش نظر رکھ کر اس شعر کو موزوں کیا ہے۔

عمر میری ہوگئی صرفِ بہارِ حسنِ یار
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب

جب کوئی صحت مند توانا شخص شدید غم سے دوچار ہوتا ہے تو رونے پیٹنے لگتا ہے۔ اگر وہ ضعیف اور ناتواں ہو جائے تو ایسی صورت میں صرف سرد آہیں بھرے گا۔

پانی کو 100 ڈگری سلسیس تپش تک گرم کیا جائے تو وہ جوش کھانے لگتا ہے۔ جس پر پانی کے سالمات کی توانائی میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا ہے اور وہ بھاپ بن کر بلبلوں کی شکل میں آزاد ہوتے ہیں۔ بغیر گرم کیے ہوئے پانی میں عمل تبخیر (Evaporation) واقع ہوتا ہے۔ تب پانی کے سالمات کی توانائی بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود سطح آب پر کے سالمات، اندرونی سالمات سے توانائی حاصل کر کے بخارات میں تبدیل ہوتے ہیں۔ عمل تبخیر ایک سست عمل ہے جو سطح آب پر واقع ہوتا ہے۔ پانی کا جوش کھانا ایک تیز رفتار عمل ہے جو کسی برتن میں رکھے گئے تمام پانی میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ پانی کا جوش کھانا تو ہمیں نظر آتا ہے لیکن عمل تبخیر کے ذریعہ پانی کا بخارات بننا نظر نہیں آتا۔ اس لئے اس عمل پر یقین کرنا ذرا دشوار ہوتا ہے۔

انیسویں صدی کے تمام ذی شعور اور تعلیم یافتہ افراد عناصر ترتیبی، ہوا، پانی، زمین اور آگ سے واقف تھے۔ چوں کہ ترتیب عناصر اپنی آزادانہ حیثیت برقرار رکھتے ہیں اور وہ ایک دوسرے میں تبدیل نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ پانی جب بخارات بن کر ہوا ہو جاتا ہے تو اس پر یقین کرنا دشوار ہوتا ہے۔ غالبؔ نے فطرت کے اس اصول کو گریہ اور دمِ سرد کے استعاروں میں کیا خوب شعری پیرہن عطا کیا ہے۔

ضعف سے گریہ مُبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

سائنس میں بقائے مادّہ اورتوانائی کے کلیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دونوں ہی نہ پیدا کئے جاسکتے ہیں اور نہ فنا۔ البتہ مادّے کی ایک حالت کو دوسری حالت میں اورتوانائی کی ایک قسم کو دوسری قسم میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ آئین اسٹائن کی کمیت اورتوانائی کے معدل کی مساوات کی رو سے کمیت اورتوانائی دونوں کی غیرفنا پذیری کی اوران کو ایک دوسرے میں تبدیل کئے جانے کی تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادّہ کوتوانائی میں اورتوانائی کو مادّہ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالبؔ کو مادّہ اورتوانائی کی غیرفنا پذیری کا علم تھا، تب ہی تو انھوں نے یہ اشعار کہے ہیں۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی، کہ پنہاں ہوگئیں

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

ڈرائیور نشے کی حالت میں موٹر گاڑیاں تیز رفتار سے چلاتے ہیں جو اکثر ان کے کنٹرول سے باہر ہو جاتی ہیں اور حادثات رونما ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نشے کی حالت میں موٹر گاڑیاں چلانا قانوناً جرم قرار دیا جاتا ہے۔

جب کسی مقام پر کوئی تیز رفتار گاڑی گذرتی ہوئی نظر آتی ہے تو ٹریفک پولیس کو اس بات کا شبہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ڈرائیور شائد نشہ کی حالت میں ہو۔ اس بات کی تصدیق کے لئے پولیس کے عہدیدار فارنسک سائنس کے ایک آلے Breath Analyser سے مدد لیتے ہیں۔ اس تصدیق میں یہ آلہ سانس کے ذریعہ چھوڑی گئی ہوا کو حاصل کرتا ہے اور اس ہوا کی پیمائش کر کے یہ بتلاتا ہے کہ آیا اس میں شراب کے بخارات ہیں یا نہیں؟ اگر ہوا میں شراب کے بخارات شامل رہیں تو ڈرائیور کا حالتِ نشہ میں ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ غالبؔ کا یہ شعر Breath Analyser کی کارکردگی سے مطابقت رکھتا ہے۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

شمع جلانے کے لئے جلتی ہوئی ماچس جب اس کے قریب لائی جاتی ہے تو سب سے پہلے اس کی بتی جلنے لگتی ہے۔ اس کے بعد ایک لمحہ میں موم پگھلتا ہے اور پھر وہ بخارات میں تبدیل ہوتا ہے۔ جب موم کے بخارات جلنے لگتے ہیں تو شمع روشن ہو جاتی ہے۔ شمع اس وقت تک روشن رہتی ہے جب تک موم پگھل کر بخارات میں تبدیل ہوتا رہے۔

جب پروانہ شمع پر منڈلاتا ہے تو اس کے پروں کی ہوا موم کے بخارات کی فراہمی میں خلل پیدا کرتی ہے، جس کی وجہ سے شعلہ لرزنے لگتا ہے اور اس کی روشنی میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمع ناتواں ہو گئی ہے۔

جب کوئی پروانہ شمع کی لو سے راست ٹکرا کر جاں بحق ہو جاتا ہے تو موم کے بخارات کی فراہمی ایک لمحہ کے لئے مکمل طور پر منقطع ہو جاتی ہے اور شعلہ بہت زیادہ لرزتا ہے۔ کبھی کبھی تو شمع ہی گل ہو جاتی ہے۔ شمع اور پروانے کے اس تعلق کو غالبؔ نے کس نازک خیالی سے پیش کیا ہے۔

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے، اے شعلہ!
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

سائنسی علوم میں کیمیائی عناصر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ علم کیمیاء، حیاتیات، ارضیات کی تحقیق، ہماری صحت کی بقاء اور ملک کی معاشی ترقی میں عناصر اہم رول انجام دیتے ہیں۔ یوں تو اب تک 118 عناصر دریافت ہو چکے ہیں لیکن 400 سال قبل مسیح میں انبذ قلیس Empedcles نے چار عناصر کا نظریہ پیش کیا تھا، جس کی رو سے زمین، پانی، ہوا اور آگ عناصر ترتیبی قرار دیئے گئے تھے۔ ارسطو نے بھی اس نظریئے کی وکالت کی تھی۔ یہ نظریہ اس وقت غلط ثابت ہوا جب اٹھارہویں صدی کے ختم پر سائنس دانوں نے حقیقی عناصر کا پتہ لگایا۔

ایک عرصے تک زمین کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ حالتِ سکون میں رہتی ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ پانی میں نمی پائی جاتی ہے کیوں کہ اس کو گرم ہونے کے لئے دوسری اشیاء کے مقابلہ میں زیادہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہوا کو کسی پل ٹھہراؤ نہیں رہتا، اس کے سالمات ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں۔ آگ اپنی تمازت کے لئے شہرت رکھتی ہے۔ غالب نے عناصر اربعہ کی ان خصوصیات کا ذکر اس شعر میں کیا ہے۔

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

پیڑ پودوں کے پتے روشنی کی موجودگی میں عملِ شعاعی ترکیب (Photo Synthesis) پر کاربند رہتے ہوئے فضاء کی کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آبی بخارات کو جذب کر کے نباتات کے لئے غذا فراہم کرتے ہیں اور آکسیجن کو آزاد کرتے رہتے ہیں۔ جب کہ ان کی جڑیں پانی جذب کرتی ہیں۔ اس پانی کا نوے فیصد سے زیادہ حصہ پتوں کی سطح سے عمل تبخیر (Evaporation) کے ذریعہ فضاء میں شامل ہوتا رہتا ہے۔ ان قدرتی عوامل کی بدولت پیڑ پودے، پھلتے اور پھولتے ہیں اور فضاء میں آکسیجن کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ مقدار میں آبی بخارات کو شامل کرتے ہیں۔ یہ آبی بخارات اوپر اُٹھ کر بادل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ غالبؔ نے نباتات اور ہوا کے باہمی رشتے کو استفہامیہ انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

روئے زمین پر انواع واقسام کے نباتات پائے جاتے ہیں۔انھیں ساخت اور جسامت کے لحاظ سے سبزہ، بوٹا، مشروم، پودا، بیل، جھاڑی اور درخت میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ غذاؤں پر جمنے والی پھپھوند (Fungi) اور پانی پر اُگنے والی کائی بھی نباتات ہی کی قسمیں ہیں۔غالبؔ بھی اس بات سے بخوبی واقف تھے۔تب ہی تو وہ کہتے ہیں۔

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

پودوں کو اُگانے کے لئے بیج بوئے جاتے ہیں۔ بیج کا پوست پانی کے لئے رغبت رکھنے والا (Hydrofolic) ہوتا ہے جو مٹی میں موجود پانی کو ایک خاص عمل Imbibation کے ذریعہ جذب کرتا ہے۔

بیج کے مرکزی حصے میں Embryo ہوتا ہے جس میں سے کونپل پھوٹتی ہے۔ Embryo میں بھی پانی کے لئے رغبت پائی جاتی ہے تا کہ کونپل کے پھوٹنے کا عمل طئے پاسکے۔ Embryo کا تعلق ایک رگ کے ذریعہ بیج کی سطح پر پائے جانے والے ایک سوراخچہ (Micropyle) سے ہوتا ہے۔ زمین کا پانی سوراخچہ کے ذریعہ بیج میں داخل ہوتا ہے جو رگ کے ذریعہ وقفہ وقفہ سے Embryo تک پہنچتا ہے۔ غالباً بیج کے پانی کو حاصل کرنے کے اس عمل سے غالبؔ واقف رہے ہوں گے تب ہی تو انھوں نے یہ شعر کہا ہے۔

بس کہ زیرِ خاک، با آبِ طراوت راہ ہے
ریشے سے ہر تخم کا دلو اندرونِ چاہ ہے

انسان کی طرح حشرات الارض بھی اپنے بچوں کے لئے نہ صرف غذا فراہم کرتے ہیں بلکہ وافر مقدار میں اس کا ذخیرہ بھی کرتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں، پھولوں کا رس (Nectar) چوس کر چھتے میں جمع کرتی جاتی ہیں۔ یہ شہد لاروا (Larvae) کے علاوہ خود مکھیوں کے لئے بھی غذا کے طور پر کام آتا ہے۔ شہد جمع کرنے کے اس عمل میں پھولوں کے رس کے ساتھ مکھیوں کے منہ کی رطوبت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے غالبؔ نے شہد پر شراب کو ایک انوکھے انداز میں فوقیت دی ہے۔

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد!
مئے ہے یہ مگس کی قئے نہیں ہے

ہم غذا کے طور پر جو کچھ بھی کھاتے ہیں وہ مکمل طور پر ہضم ہونے سے قبل دو اہم مرحلوں سے گذرتی ہے۔ پہلے وہ کیلوس (Chyme) کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پھر کیموس (Chyle) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان دونوں مدارج طئے کرنے کے بعد غذا ہضم ہوتی ہے اور خون بنتا ہے۔ خون ہماری رگوں میں دوڑتے ہوئے جسم کے تمام حصوں کو درکار توانائی کی فراہمی کے لئے آکسیجن، گلوکوز وغیرہ مہیا کرتا ہے۔

جب کوئی شخص بیمار پڑ جاتا ہے تو اس کا کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے۔ تب اس کے جسم کی چربی غذا کا نعم البدل ثابت ہوتی ہے جو خون میں شامل ہوتی رہتی ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ بیماری کی حالت میں لوگوں کا وزن کم ہو جاتا ہے اور وہ دبلے نظر آتے ہیں) اس طرح بیمار شخص وقتی طور پر غذا کے استعمال سے فراغت پاتا ہے۔ جب غذا کا استعمال ہی نہیں ہوتا تو اس کو ہاضمے کے مدارج کیلوس اور کیموس سے گذرنا نہیں پڑتا۔ بیماری کی صورت میں جسم خود غذا کی جو یا بجائی کرتا ہے، اس کو غالبؔ نے یوں نظم کیا ہے۔

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیان
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

نظر کے بارے میں ابتداء میں یہ تصور تھا کہ وہ آنکھ سے نکل کر کسی شئے پر پڑتی ہے تو وہ شئے ہمیں دکھائی دیتی ہے۔اسی مناسبت سے نگاہ ڈالنا، نگاہِ کرم، تیز نگاہ جیسے اور بھی بہت سے استعارے عالم وجود میں آئے۔

جب کوئی گہرا زخم بہت پرانا ہو جاتا ہے تو اس میں مواد کے ساتھ ساتھ گیس بھی بھر جاتی ہے۔ اگر اس زخم پر نشتر لگایا جائے تو زخم میں سوراخ پڑ کر اندر کی گیس باہر نکل آتی ہے۔نظر کو شعاع مان لیا جائے تو زخم کے لئے تیز نظر، نشتر کا کام کرے گی جس کی وجہ سے زخم میں پڑنے والے سوراخ سے گیس باہر نکلے گی۔غالبؔ نے اسی بات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

جب ہم سانس لیتے ہیں تو ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے جہاں پر آکسیجن خون میں شامل ہوتی رہتی ہے۔ ہمارا دل آکسیجن ملے ہوئے خون کو پمپ کر کے سارے جسم میں پہنچاتا ہے۔ خون کی آکسیجن کیمیائی تعامل کے ذریعہ شکر کو کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ یہ توانائی اعضائے جسمانی کو بروئے کار لانے میں صرف ہوتی ہے۔

جسم کے مختلف اعضاء کو توانائی کی مختلف مقدار درکار ہوتی ہے۔ تمام اعضاء میں دل ایک ایسا عضو ہے جو دماغ کے بعد سب سے زیادہ مصروف رہتا ہے۔ اس کو عمل پیرا رہنے کے لئے دوسرے اعضاء کے مقابلے میں زیادہ توانائی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالبؔ نے یہ اشعار اسی موضوع پر کہے ہیں۔

ایک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

جلتا ہے دل کیوں نہ ہم ایک بار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

جب ہم احساسات اور جذبات سے مغلوب ہوتے ہیں تو ہمارا دورانِ خون بڑھ جاتا ہے اور دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، جس پر ہم یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کا تعلق دل ہی سے ہے۔ لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو احساسات اور جذبات کا تعلق دل سے نہیں بلکہ دماغ سے رہتا ہے۔ چنانچہ عشق جیسے نازک اور حساس جذبے کا تعلق بھی دماغ سے ہی رہتا ہے۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق برطانوی عصبیت دانوں (Neurologists) نے عشق کو ایک خاص دماغی عمل بتلایا ہے۔ انھوں نے اس بات کا پتہ بھی لگایا ہے کہ عشق میں مبتلا کسی شخص کو جب اس کے محبوب کی تصویر دکھلائی جائے تو دماغ کے ایک مخصوص حصّے میں تحریک بڑھ جاتی ہے اور دوسرے حصّوں میں دماغی عوامل نمایاں طور پر کم ہو جاتے ہیں۔ میڈیکل سائنس کی اس دریافت سے غالبؔ کے اس شعر کی تصدیق ہوتی ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ہیرا اپنی چمک اور سختی کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں حرارتی موصلیت (Heat Conductivity) سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ عام طور پر حرارتی موصل، برق کے لئے اچھے موصل ثابت ہوتے ہیں، لیکن ہیرا اس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ برق کے لئے غیر موصل ہوتا ہے۔ اس کی حرارتی موصلیت چاندی اور تانبہ کی حرارتی موصلیت سے بھی زیادہ ہوتی ہے، جو سب سے زیادہ برقی موصلیت کے حامل ہیں۔

اگر زائد حرارتی موصلیت رکھنے والی شئے کو کسی گرم مقام سے حالتِ تماس میں لایا جائے تو اس مقام کی بہت زیادہ حرارت اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس طرح گرم مقام کی تپش میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ طاقت کی برقی رو گذارنے والے نازک الکٹرانکس آلات کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے ہیرے کو حرارتی جاذب (Heat Sink) کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر مرہم بنانے میں ہیرے کے ریزے شامل کئے جائیں تو ہوسکتا ہے وہ زخم کی گرمی کو جذب کر کے ٹھنڈک پہنچانے کا باعث ہوں گے۔ غالبؔ ہیرے کی اس خصوصیت سے شائد واقف رہے ہوں تب ہی تو انھوں نے یہ شعر موزوں کیا ہے۔

نہ پوچھ نسخہ مرہم، جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس، جزوِ اعظم ہے

علم میکانیات (Mechanics) کے لئے ایک اصطلاح جرِثقیل بھی استعمال ہوتی ہے۔ یہ علم طبیعیات کی وہ شاخ ہے جس میں اجسام پر قوتوں کے عمل سے بحث کی جاتی ہے۔ جب کسی جسم پر کوئی قوت عمل کرتی ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ نقلِ مکانی کرتا ہے۔ جسم جتنا وزنی ہوگا، اس کی نقلِ مکانی کے لئے اتنی ہی زیادہ قوت درکار ہوگی۔

ڈر و خوف سے ہمیں جو گھبراہٹ ہوتی ہے، اس کا احساس دل کی تیز دھڑکن سے ہوتا ہے۔ ایسے میں پورے حواس برقرار رکھنے کے لئے اعضائے جسمانی کو آکسیجن کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی پابجائی دل کے ذریعہ ہوتی ہے۔ دل، خون کو جتنی تیزی سے پمپ کرے گا اس کی تپش اور دھڑکن میں اتنا ہی زیادہ اضافہ ہوگا۔ ایسے وقت ہماری سانس پھولنے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جرِثقیل کے اصول کو کام میں لائے بغیر شائد ہمارا سانس لینا دشوار ہوگیا ہے۔ غالبؔ کا یہ شعر ایسے ہی موقع کی غمازی کرتا ہے۔

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل

سرمہ کے متعلق یونانی طبیبوں کا یہ ماننا ہے کہ اس کو آنکھ میں لگانے سے نظر تیز ہوتی ہے اور بینائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ایک اور بات اس کے متعلق تسلیم کی جاتی ہے کہ اس کو کھانے سے ہماری آواز بیٹھ جاتی ہے۔سرمہ کی یہ دونوں خصوصیات بڑی حد تک ممکنات میں شامل ہیں۔سرمہ کھانے پر یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ذرات آواز پیدا کرنے والے Vocal Chords پر جم جاتے ہوں، تب ضروران کے حیطۂ ارتعاش (Amplitude of Vibration) میں کمی واقع ہوکر آواز بیٹھ جاتی ہوگی۔غالب نے سرمہ کی ان خصوصیات کو کتنے حسین پیرائے میں شعر کا روپ دیا ہے۔

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہِ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

آئینہ سامنے والے ہر منظر کو منعکس کر دیتا ہے۔ اس میں انعکاس کی جو خاصیت پائی جاتی ہے وہ شیشہ کی پشت پر پائے جانے والے پارے کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ ورنہ وہ صرف ایک شیشہ ہے، چاہے وہ کتنا ہی صاف اور شفاف کیوں نہ ہو۔

بنی نوع انسان کے تمام اعضائے جسمانی میں دل ایک بہت ہی اہم عضو ہے۔ اگر دل اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو انسان کا وجود باقی نہیں رہ جاتا۔ یہاں تک کہ دماغ جیسے حساس عضو کے خراب ہونے کے باوجود بھی لوگ، صحت مند دماغ رکھنے والوں کی طرح ایک بڑی عمر تک جی لیتے ہیں۔ لیکن دل کی خرابی ان کو موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔ اس شعر میں غالبؔ نے آئینہ میں پارہ کی اور انسانی جسم میں دل کی اہمیت کا کیا خوبصورت انداز میں تقابل کیا ہے۔

سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے، ہم
حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

ہمارا دل ہمیشہ ایک وولٹ کے ہزارویں حصے پر مشتمل برقی لہروں کو خارج کرتا رہتا ہے۔ صحت مند دل میں سے نکلنے والی یہ لہریں مخصوص وضع قطع اور فریکوینسی کی ہوتی ہیں۔کوئی اچھا بھلا شخص جب پریشانیوں اور فکروں میں گھرا ہوا ہوتو اس کے دل سے نکلنے والی لہروں کی وضع قطع میں فرق آجاتا ہے۔ کارڈیالوجسٹ ECG کی مدد سے ریکارڈ شدہ ان لہروں کا مشاہدہ کر کے مریض کے دل کی کیفیت کا پتہ لگالیتے ہیں۔غالبؔ نے اس شعر میں دل کے لرزنے کو بڑی ہی نازک خیالی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ہجومِ فکر سے دل، مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

تمام اشیاء دو طرح سے جلتی ہیں ۔ایک طرح کے جلنے میں شعلہ پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرح میں وہ شعلہ پیدا کئے بغیر ہی جلتی ہیں ۔شعلہ پیدا کئے بغیر اشیاء کا جلنا Condensed Phase کہلاتا ہے۔اگربتی کا جلنا اس کی ایک بہترین مثال ہے۔

جو لوگ الکوہل یعنی شراب کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں ان کے قلب میں جلن کے ساتھ ہلکی سی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ تکلیف بڑھتے بڑھتے حلق اور نرخرے تک پہنچ جاتی ہے۔قلب کی اس جلن کو طبی اصطلاح میں Heart Burn کہتے ہیں۔غالبؔ نے قلب کی جلن کو Condensed Phase میں جلنے سے تعبیر کیا ہے۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابہ جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

زمانے کے ظلم وستم کا مارا کوئی شخص جب آہ وزاری کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو غموں کے بوجھ سے ہلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ اپنے غموں کو ضبط کرتا رہے تو اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ کہیں وہ مرض دِق میں مبتلا نہ ہو جائے۔

بارش کا پانی، ندی نالوں کی شکل میں بہہ کر دریا میں جاملتا ہے۔ اگر اس پانی کی نکاسی کا انتظام نہ رہے تو وہ زمین میں جذب ہوکر زیر زمین آبی ذخائر میں اضافے کا موجب بنتا ہے۔ غالبؔ نے غموں کے ضبط کرنے اور بارش کے پانی کے زمین میں جذب ہونے کی صورتوں کو کتنے حسین انداز میں نظم کیا ہے۔

سینے کا داغ ہے وہ نالہ، کہ لب تک نہ گیا
خاک کا زرق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

سورج ایک ستارہ ہے۔ وہ اپنی حرارت اور روشنی کو زمین سمیت نظام شمسی کے تمام سیاروں پر بکھیرتا رہتا ہے۔ زمین، سورج سے کئی گنا چھوٹی ہے۔ جب کہ انسان کی جسامت زمین کے مد مقابل کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور سورج کے مقابل تو اس کی وقعت شبنم کے ایک قطرے کی سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ نہ صرف کمیت کی اساس پر حقیر ہے بلکہ حرارت اور روشنی کے معاملہ میں بھی۔ اس کو توانائی اسی وقت حاصل ہوتی ہے، جب سورج طلوع ہو کر اپنی کرنیں اس پر نچھاور نہ کر دے۔ شبنم کا قطرہ کسی مقام پر ساکت رہتا ہے۔ اس کو متحرک رہنے کے لئے فضاء میں واپس جانا پڑے گا، جہاں پر وہ سرد ہو کر شبنم کی شکل اختیار کر لیا تھا۔ غرض شبنم کے حقیر سے قطرے کو بھی تحریک حاصل کرنے کے لئے سورج ہی سے توانائی حاصل کرنا پڑتا ہے۔ فطرت کی اس حقیقت کو غالبؔ نے ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نظریۂ اضافیت (Theory of Relativity) کی رو سے وقت اور رفتار دونوں ہی مقداریں اضافی ہوتی ہیں۔ جب ہم ان سے متعلق کوئی رائے قائم کرتے ہیں تو ہمیں مخصوص زمان اور مکان کے دائرے کار میں رہ کر بات کرنی پڑتی ہے۔ سفر میں منزل کا تعین اور سمتِ سفر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ہماری منزل حالتِ سکون میں ہو اور ہماری سمتِ سفر ایک ایسے راستے پر متعین ہو کہ وہ راستہ اس تک پہنچ ہی نہیں سکتا، تو صاف ظاہر ہے کہ منزل ہمیشہ ہم سے دور رہے گی۔ اگر منزل خود متحرک ہو اور ہماری سمتِ سفر، منزل کی سمتِ سفر کے مخالف ہو تو تب بھی منزل ہم سے دور ہوتی رہے گی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم پریشان حال منزل کی تلاش میں بھٹک رہے ہوں تو ایسے عالم میں راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ اس کے باوجود ہم چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ لیکن حیرانی اور پریشانی کے عالم میں منزل کی سمت کا تعین نہیں کر سکتے، اس لئے منزل تک پہنچ نہیں پاتے اور ہر قدم پر منزل ہم سے دور ہی رہ جاتی ہے۔ غالبؔ نے اس شعر میں انہی کیفیات کی عکاسی کی ہے۔

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

سمندر کا پانی بخارات بن کر ہوا کی رطوبت میں اضافہ کرتا ہے۔ اگر سمندر نہ ہوں تو ہوا میں آبی بخارات نہ ہوں گے۔ آبی بخارات کے بغیر زمین پر نہ موسم کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ بادل، بارش اور دریا کا۔ ان کے بغیر نباتات، حیوانات اور بنی نوع انسان تک کا وجود باقی نہیں رہتا۔ غرض سمندر نہ ہوں تو پوری دنیا ایک ویران سیارے میں تبدیل ہو جائے گی۔ غالبؔ نے اسی اندیشہ کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے۔

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

زمین کی فضاء میں آبی بخارات عمومی تپش اور دباؤ پر کیسی حالت میں برقرار رہتے ہیں۔ کسی بھی مقام پر رات میں فضاء کی تپش میں بڑی حد تک کمی واقع ہوتی ہے۔ جس پر آبی بخارات کے حجم میں کمی واقع ہو کر فضاء کے دباؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔ کم تپش اور زائد دباؤ کے اس ماحول میں آبی بخارات، شبنم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ فطرت میں وقوع پذیر ہونے والے اس عمل کو غالبؔ نے کتنی نازک خیالی سے نظم کیا ہے۔

فشارِ تنگئ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

ریگستان میں سر پر جب سورج چمک رہا ہو اور پیروں تلے گرم ریت کسی پیاسے مسافر کے پیروں کو تلوار کی دھار کی طرح کاٹ کاٹ کر چھلنی کر رہی ہو تو ایسے میں جدھر بھی وہ نظریں دوڑائے گا اسے دور کسی مقام پر نیلی جھیل نظر آئے گی جو سوائے سراب کے کچھ نہیں رہتا۔ سراب دراصل سائنس کے اصول کے تحت نظر آتا ہے۔

ریگزاروں پر کی گرم فضاء کثافت کی مختلف پرتوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نیلے آسمان سے آنے والی سورج کی نیلی نیلی شعاعیں جب فضاء کی ان پرتوں میں سے گذرتی ہے تو ان کا کلی داخلی انعکاس Total Internal Reflection واقع ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں نیلے آسمان کی ایک جھلک دور زمین پر نظر آنے لگتی ہے۔ گویا کہ آسمان جھک کر زمین کو چھولیا ہو۔ دیکھنے والے مسافر کو یہ منظر جھیل کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب وہ آگے بڑھتا چلا جائے تو سراب ہی سراب رہ جاتا ہے۔ غالبؔ نے موجِ سراب کو دشتِ وفا سے کیا خوب تشبیہہ دی ہے۔

موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

انسان کی عمر جوں جوں بڑھاپے کی طرف بڑھتی جاتی ہے اس کے جسمانی کام کرنے کی صلاحیت تیزی کے ساتھ گھٹتی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے بھاگ دوڑ کرنے کی رفتار میں کمی واقع ہوتی ہے۔ حالاں کہ تجربے کی بنا پر اس کے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کے ذہن کی رفتار سے اعضاء بھی حرکت میں رہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی عمر ہی اس کی رفتار کی تیزی میں مانع بن جاتی ہے۔ اسی بات کو غالبؔ نے تشبیہہ کے ذریعہ یوں بیان کیا ہے۔

باعثِ واماندگی ہے عمر فرصت جو مجھے
کر دیا ہے پابہ زنجیر رمِ آہو مجھے

تمام ذرات اور سالمات حالتِ ارتعاش میں رہتے ہیں۔ جس کا انحصار تپش پر ہوتا ہے۔ ان کی تپش جتنی زیادہ ہوگی تعدد ارتعاش (Frequency of Vibration) اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ جس کے نتیجہ میں ان سے حرارتی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں۔ ان کی یہ ارتعاشی کیفیت ایک طرح سے ان کی بے قراری کو ظاہر کرتی ہے۔ جو دراصل ایک دوری حرکت (Periodic Motion) کہلاتی ہے۔

ہمارا دل جسم میں خون کو پمپ کرتا ہے۔ اس عمل کے دوران وہ پھیلتا اور سکڑتا ہے۔ دل کا پھیلنا اور سکڑنا بھی ایک دوری حرکت پر مشتمل ہوتا ہے جو اس کی بے قراری کو ظاہر کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سے لہریں آزاد ہوتی رہتی ہیں۔ جن کو ECG کی مدد سے ریکارڈ کیا جاتا ہے۔

دل کی بے قراری اور بے جان ذرّوں کی ارتعاشی حرکت میں جو مطابقت پائی جاتی ہے اس کو غالبؔ نے شاعرانہ انداز میں یوں ظاہر کیا ہے۔

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گذر نہ کر
ہر ذرّے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

فطرت کا مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ کائنات کے تمام نظام نہ صرف متحرک ہیں بلکہ زمان و مکان کے ساتھ تغیر پذیر بھی۔ کہکشائیں گھومتی رہتی ہیں اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوتی جارہی ہیں۔ نئے نئے ستارے تشکیل پاتے ہیں اور قدیم ستارے اپنی چمک دمک کھوکر دوسری ہی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ سطح زمین پر بھی مقام اور وقت کے ساتھ ساتھ موسم بدلتے ہیں اور صبح اور شام کے ساتھ منظر بدلتے ہیں۔ انسان، حیوانات، نباتات، جمادات کی ہیئت بدلتی ہے۔ فطرت، کائنات کی اس کاری گری میں مسلسل مشغول ہے جو بظاہر ہمیں دکھائی نہیں دیتی۔ اسی بات کا اظہار غالبؔ کے ان اشعار میں ہوتا ہے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اور

حسنِ خود آرا کو ہے ربطِ تامل ہنوز
غنچے میں دل تنگ ہے حوصلۂ گل ہنوز

نظام شمسی میں پائے جانے والے تمام اجسام، سورج کی جانب کشش رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیارے، چاند اور شہابی اجسام راست یا بالواسطہ سورج کے اطراف گردش کرتے رہتے ہیں۔ ان تمام اجرام فلکی میں سورج ہی ایک ستارہ ہے جو بذات خود منور ہے۔ باقی تمام سورج کی روشنی حاصل کر کے چمک دار نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ فضاء میں پائے جانے والے گرد کے ذرات بھی سورج کی شعاعوں سے ہی منور نظر آتے ہیں۔ جس کا مشاہدہ کچے مکانوں کی چھتوں سے چھن کر آنے والی دھوپ میں کیا جاسکتا ہے۔ فطرت کی اس حقیقت کو غالبؔ نے ان اشعار میں ایک انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔

ہر ایک ذرّہ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز

اور

کچھ نہ کی، اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں
ذرّہ ذرّہ، روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

علم طبیعیات میں نیوٹن کے پہلے کلیہ حرکت کی رو سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کوئی شئے حالت سکون میں ہو تو وہ اسی حالت میں جوں کی توں برقرار رہتی ہے تاوقتیکہ کوئی بیرونی قوت اس پر عمل نہ کرے اور اس کی حالتِ سکون کو حالتِ حرکت میں تبدیل نہ کر دے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی قوت خود بخود عمل پیرا نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے پس پردہ کوئی توانائی یا توانائی رکھنے والی کوئی شئے نہ ہو۔ کوئی شئے سے مراد چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ یا بڑے سے بڑا کوئی ستارہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ پوری کائنات بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ فضاء میں پائے جانے والے گرد کے ذرات کو حرکت میں لانے کے لئے قوت کی شکل میں سورج سے حاصل کردہ حرارتی توانائی درکار ہوتی ہے۔ جس کا مشاہدہ ہم کچے مکانوں میں چھتوں کے سوراخوں سے چھن کر آنے والی روشنی میں کرتے ہیں۔ غالبؔ شائد طبیعیات کی اس حقیقت سے آگاہ رہے ہوں، تب ہی تو وہ کہتے ہیں۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

ہے تجلی تیری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

سائنس اور ٹکنالوجی نے جتنی بھی ترقی کی ہے اس کے پیچھے ذہین لوگوں کا دماغ اور ان کے ہاتھ کارفرما رہے ہیں، جنھوں نے پہلے پہل ایجاد و اختراع کے بارے میں تصور کیا اور پھر ان کی ہو بہو نقل اُتاری۔ بیشتر ایجادات جب تک سائنس دانوں کے تصورات میں تھے دنیا نے ان کے عالم وجود میں آنے کو تقریباً ناممکن ہی قرار دیا تھا۔ جب ان تصورات نے عملی جامہ پہنا اور ان کے پیکر لوگوں کی نظروں کے سامنے نمودار ہوئے تب ہی انھوں نے ان کی حقیقت کو تسلیم کیا۔ غالبؔ نے اسی بات کو ایک منفرد انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ
نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز

دنیا میں ہرے بھرے پیڑ، پودے، جنگل ——— اونچے نیچے سبز، کالے، برفیلے پہاڑ ——— دریا، ندی، آبشار، سب کے سب اپنے اندر ایک جمالیاتی حسن رکھتے ہیں۔ فطرت کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ وہ حسین نہیں ہے۔ اس کے باوجود انسان برسہا برس سے اپنے ماحول کو حسین بنانے کی سعی کرتا آ رہا ہے تاکہ وہ اپنی اس کوشش پر فخر کر سکے۔ دیکھا جائے تو وہ فطرتی حسن میں بگاڑ پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ماحولیاتی آلودگیوں کا پیدا ہونا فطرت میں مسلسل دخل اندازی ہی کا نتیجہ ہے۔ غالبؔ نے فطرت کی کاری گری میں مصنوعی حسن پیدا کرنے والی ناحق کوششوں کو ایک نئے پیرائے میں نظم کیا ہے۔

غافل بہ وہمِ ناز، خود آرا ہے، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں، طرۂ گیاہ کا

پھولوں سے خوشبودار نامیاتی مرکبات (Aromatic Organic Compounds) گیسی حالت میں نکلتے رہتے ہیں۔

جب کوئی شخص غم سے نڈھال آہ وفغاں کرتا ہے تو اس کی چھوڑی ہوئی سانس کے ساتھ نکلنے والی سرد آہیں، ہوا میں شامل ہوتی رہتی ہیں۔

جلتے ہوئے چراغ سے گرم دھوئیں کی شکل میں کاربن کے ذرات اور آکسائیڈس فضاء کو آلودہ کرتے رہتے ہیں۔

خوشبو، آہیں اور دھوئیں کے سالمات جب فضاء میں پھیلنے لگتے ہیں تو گرد کے ذرات اور ہوا کے سالمات ان کے پھیلنے میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں وہ فضاء میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتے ہیں اور ان میں ایک اضطراری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کا اظہار غالبؔ نے کیا خوب کیا ہے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

سائنس کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مادّہ ،ٹھوس ، مائع اور گیس کی حالتوں میں اور توانائی اپنی تمام تر قسموں میں، ایک مقام سے دوسرے مقام تک موج کی شکل میں سفر کرتی ہے۔ موسم بہار کی کسی خوش گوار شام کی منظر نگاری یوں کی جاسکتی ہے کہ چمن میں پھول کھلے ہیں۔ بادصبا خراماں خراماں چل رہی ہے۔ موسم کا بھرپور لطف اُٹھانے والے من موجی حضرات محفل مئے نوشی سجائے بیٹھے ہوں تو چاروں طرف لہریں ہی لہریں تیرتی ہوئی محسوس ہوں گی ۔ بادصبا کی لہریں ، جھومتی ہوئی پھولوں کی ڈالیوں سے نکلنے والی خوشبو کی لہریں ، اُفق سے اُٹھنے والی شفق کی سرخ لہریں اور شراب کے بخارات کی لہریں فضاء میں پھیل جائیں گی۔ غالبؔ نے ایسی ہی کسی خوبصورت شام کی منظر نگاری کی ہے۔

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل ،موجِ شفق ،موجِ صبا،موجِ شراب

کائنات میں چاند، ستارے، سیارے اور کہکشاں اصول وضوابط کے تحت حرکت پذیر ہیں۔ زمین پر کی ہر شئے اپنے اندر ایک نظام رکھتی ہے۔ پھول، پتے، سبزہ اور پودے سب کے سب مخصوص نظام کے تحت مختلف مدارج طئے کرتے ہوئے نشو ونما پاتے ہیں۔ ہواؤں کے چلنے کا اپنا ایک نظام ہے۔ دریاؤں کے بہنے کی اپنی ایک سمت ہے۔ خود ہمارے جسم میں موجود تمام نظاموں کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ہر نظام ایک قاعدے کے ساتھ عمل پیرا ہے۔ تنفّسی نظام، ہضمی نظام، خون کا دوری نظام، اعصابی نظام وغیرہ اپنی اپنی ہیئت میں ایک دستورِ حیات رکھتے ہیں۔ ان کے روبہ عمل رہنے پر ہی ہماری صحت اور بقا کا دارومدار ہے۔

جب تک دنیا قائم رہے گی، یہاں کے سارے نظام اپنی اپنی انفرادیت برقرار رکھیں گے۔ جیسے وہ ختم ہو جائے گی تمام نظام ناکارہ ہو جائیں گے۔ اسی طرح جیسے ہی ہماری روح پرواز کرے گی جسم کے تمام نظام عملاً مفقود ہو جائیں گے۔ جب تمام نظام باقی نہیں رہیں گے تو ان میں کوئی فرق بھی نہیں رہے گا۔ سب کے سب ایک جیسے نظر آئیں گے، بے جان، ساکت اور جامد۔ بقا اور فنا کے اس فرق کو غالبؔ نے یوں نظم کیا ہے۔

نظر میں ہے ہماری جادہ ٔراہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اور

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بے گانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

حرارت اور روشنی توانائی کی دو ایسی قسمیں ہیں جو برقی مقناطیسی شعاعوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہ شعاعیں فریکوینسی اور طولِ موج کے فرق کی بناء پر الگ الگ اثرات مرتب کرتی ہیں۔ کسی شئے کو کم تپش تک گرم کیا جائے تو اس کی سطح سے حرارتی اشعاع فضاء میں خارج ہوتی ہیں۔ اگر اس کی تپش کو کافی حد تک بڑھا دیا جائے تو اس سے روشنی پھوٹ پڑے گی۔ برقی بلب اس کی ایک اچھی مثال پیش کرتا ہے۔ گھروں کو سپلائی کی جانے والی برق کا وولٹیج کم ہو جائے تو بلب کا فلامنٹ روشنی پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ صرف سرخ نظر آتا ہے۔ جب کہ معمول کے وولٹیج پر یعنی اگر اس کا وولٹیج 220 وولٹ ہو تو وہ منور ہو کر پورے ماحول میں روشنی بکھیر دیتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ الکٹرک بلب پہلی صورت میں حرارت کا ماخذ تھا اور دوسری صورت میں روشنی کا۔ یہ اور بات ہے کہ روشنی کا ماخذ حرارت بھی پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلتے ہوئے بلب کی صورت میں روشنی کے حصول کے ساتھ ساتھ گرمی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

روشنی کا کوئی ماخذ جب کسی شئے کی ایک جانب رہے تو اس شئے کا سایہ دوسری جانب پڑے گا۔ جب کوئی پرندہ اُڑان بھرتا ہے تو اس کے پروں میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اس حرارت کی مقدار کا انحصار پرندے کی جسامت پر ہوتا ہے اور اس کی فریکوینسی کا انحصار اس کی رفتار پر۔ نظری طور پر یہ ممکن ہے کہ پرندہ اتنی زیادہ رفتار سے اُڑان بھر رہا ہو کہ اس کے پروں میں پیدا ہونے والی حرارتی موجوں کی فریکوینسی اعلیٰ ترین حد کو چھو لے اور وہ روشنی کی فریکوینسی کے مماثل ہو جائے۔ ایسے وقت میں اس پرندے کے پروں سے روشنی پھوٹ نکلے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس روشنی کی وجہ سے پروں کا سایہ اوپر پڑے گا۔ غالبؔ نے اپنی پروازِ تخیل سے کام لیتے ہوئے اس شعر کو موزوں کیا ہے۔

ماہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوئے
سایہ ہمچوں دود بالامی رود از بالِ ما

کرۂ ارض کے ارتقاء سے متعلق ماہرین ارضیات یہ اظہار کرتے ہیں کہ بے شمار معدنیات سے بھری ہوئی ہماری یہ زمین ساڑھے چار ارب سال قبل عالم وجود میں آئی اور ابتدائی حیات کا زمانہ ساٹھ کروڑ سال پہلے شروع ہوا، جب کہ معدنیات اور ان کے مرکبات پر مشتمل جڑی بوٹیاں، پودے جھاڑیاں اور درخت سطح زمین پر اُگ آئے۔ انسان کے وجود میں آنے کا واقعہ کوئی دس لاکھ سال پہلے کا ہے۔ علم طب کی یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان میں پیدا ہونے والی اکثر بیماریاں یا تو معدنیات کی کمی سے لاحق ہوتی ہیں یا پھر ان کی زیادتی سے۔ اس لئے ہر طریقہ علاج میں مریضوں کو جو دوائیں دی جاتی ہیں وہ معدنیات اور ان کے مرکبات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جنھیں راست معدنی ذرائع سے یا بالواسطہ نباتاتی وسائل سے حاصل کیا جاتا ہے۔ غالبؔ علم طب کی اچھی خاصی جانکاری رکھتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے یہ شعر موزوں کیا ہے۔

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاں دار بود\
پیش ازاں کیں در رسد، آں را مہیا کردہ

کرۂ ارض کے اطراف فضائی غلاف موجود ہے ۔ جس کو زمین کی کشش ثقل (Gravitational Attraction) تھامے ہوئے رہتی ہے۔ سطح زمین پر وقوع پذیر ہونے والے تمام کیمیائی تعاملات میں جو بھی گیس، آبی بخارات، دھواں یا کاربن وغیرہ کے ادھ جلے ہلکے ذرات خارج ہوتے ہیں، وہ اوپر اٹھ کر فضاء کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ فضائی غلاف ہی ہے جو ہمیں آسمان کے طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اس شعر میں غالبؔ نے آسمان کی حقیقت کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے۔

دودِ سودائے تتق بست آسماں نامیدمش
دیدہ برخوابِ پریشاں زد، جہاں نامیدمش

حرارت توانائی کی ایک قسم ہے۔ جب کسی شئے کو حرارت پہنچائی جاتی ہے تو اس کی تپش میں اضافہ ہوتا ہے، جو گرمی کی شدت کو ظاہر کرتی ہے۔ گویا حرارت وجہ ہے اور تپش یا گرمی کا احساس اس کا اثر۔ کسی گرم شئے سے نکلنے والی حرارتی اشعاع کے اثر کو کم کرنے میں ہوا معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورج کی شعاعوں یا گرم ماحول سے ہونے والی گرمی کے اثر کو زائل کرنے کے لئے پنکھوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔

کسی گرم جسم کی تپش کم کرنا مقصود ہو تو پانی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کسی کو شدید بخار ہو جائے تو اس کو کم کرنے کے لئے پنکھوں کا استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں ڈالی جاتی ہے۔ اسی بات کا تذکرہ غالبؔ کے ہاں کچھ اس طرح ملتا ہے۔

گرمی از آب بروں رفت حرارت ز ہوا
محملِ مہرِ جہاں تاب میزاں آمد

آکسیجن ہوا کا ایک اہم جز ہے۔اس کے بغیر حیات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔زمین پر کی باغ و بہار اور رنگِ چمن اسی کی دین ہیں۔نباتات،حیوانات اسی کے مرہون منت ہیں۔انسان کی بقاء کا دارومدار اسی کے وجود سے ہے۔کسی شئے کا جلنا اس پر منحصر ہے۔رات کی تیرگی کو دور کر کے اُجالوں میں تبدیل کرنے میں یہ اہم رول انجام دیتی ہے۔اس کے بغیر شمع تو کیا کوئی شئے جل نہیں سکتی۔اس طرح دنیا کی رونق اسی سے قائم ہے۔اگر آکسیجن میں کمی واقع ہو جائے تو ہر طرف ویرانی چھا جائے گی۔پیڑ پودوں کا پھلنا پھولنا متاثر ہو جائے گا۔تمام جاندار دَم گھٹتا ہوا محسوس کرنے لگیں گے۔شمع کا جلنا دشوار ہو جائے گا۔غرض ایسا محسوس ہوگا کہ سارے جہاں کے چمن میں خزاں نے ڈیرہ ڈال دیا ہو۔غالبؔ نے نور و ظلمت کو بہار اور خزاں سے یوں تعبیر کیا ہے۔

بادِ دامن زد بر آتش، نو بہاراں خواندمش
داغ گشت آن شعلہ از مستی خزاں نامیدمش

ماہر طبیعیات De Broglie نے مادّہ کی دوہری فطرت Duel Nature of Matter کے نظریئے کو پیش کیا تھا۔ تجربات کی روشنی میں اس نظریئے کی تصدیق بھی ہو چکی ہے۔ اس نظریئے کی رو سے جب کوئی مادی جسم ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہمیشہ ایک موج منسلک رہتی ہے۔ اس موج کا طول اور اس کی فریکوینسی کا انحصار مادی جسم کی رفتار پر ہوتا ہے۔ اس طرح مادی اجسام، سفر میں مادے کی خاصیت کے ساتھ ساتھ موجی خاصیت بھی رکھتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالبؔ کو مادے کی دوہری فطرت کا وِجدانی علم رہا ہوگا تب ہی تو انھوں نے یہ شعر موزوں کیا ہے۔

گل زار دمیدن شررستان رمیدن
فرصت تپش و حوصلۂ نشو و نما ہیچ

غالبؔ کے سائنسی اشعار
ماہرینِ علم وادب کی نظر میں

مرزا غالبؔ کے جن اشعار میں سائنس کی پردہ دری نظر آتی ہے اور سائنسی اصولوں سے ان کے مفاہیم کی جو مطابقت پائی جاتی ہے، ان اشعار کے بارے میں ماہرین علم وفن، اصحاب دانش و بینش کی آراء کیا ہیں؟ اور انھوں نے ان کی تفہیم کن پیرائے میں کی ہے، اس کا پیش کیا جانا ضروری ہے۔ مختلف ماہرین علم وادب نے ان اشعار کی زمرہ بندی مختلف انداز میں کی ہے۔ کوئی انھیں فلسفیانہ شاعری سے تعبیر کرتا ہے تو کوئی حکیمانہ شاعری سے۔ کسی نے تصوفانہ کلام کے زمرے میں شمار کیا ہے تو کسی نے تفکرانہ خیالات کے شعری پیکر کا نام دیا ہے۔ چند ایک ماہرین نے تو دوٹوک اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ غالبؔ نے ان اشعار میں سائنسی اصولوں کو شعری پیرہن عطا کیا ہے، جس کے پس پردہ ان کا وہبی وِجدانی علم کارفرما رہا ہے۔ یوں تو ان کے فن شاعری اور شعورِفن پر اساتذۂ شعروسخن نے مختلف انداز میں روشنی ڈالی ہے لیکن پروفیسر احتشام حسین نے اپنے مقالہ "غالب کا شعورِفن" میں کس قدر حقیقت افروز انداز میں اظہار خیال کیا ہے:

> "غالب نے اپنی فکری راہیں تلاش کرنے میں ذہنی آزادی اور ذاتی تجربے کو اپنا رہبر بنایا، عقل سے روشنی مانگی اور تخئیل کی مدد سے جذبہ اور عقل، وجدان اور شعور کو ملا کر شعر کی تخلیق کی۔" (بین الاقوامی سمینار ۱۹۶۹، مرتبہ یوسف حسین خاں، ص 217)

اس باب میں سائنسی اشعار پر دی گئی ماہرین اور شارحین کی آراء اور مفاہیم پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے اس بات کا پتہ لگایا جاسکے گا کہ انھوں نے غالبؔ کے اس کلام کو کس کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب !
ہم نے دشتِ اِمکاں کو ایک نقشِ پا پایا

(1) ہماری تمنا کی وسعتوں کا کیا پوچھنا! ساری دنیا اور اس کے سارے امکانات اس کا محض ایک نقش پا ہیں۔ ہماری تمنا نے دوسرا قدم رکھا ہی کہاں ہے۔ اس کے لئے گنجائش ہی کہاں ہے۔

گیان چند جین

(2) شاعر خدا سے فریاد کرتا ہے کہ یارب تمنا کا دوسرا قدم کہاں ہے جب کہ سارا دشت امکاں محض اس کے ایک نقش پا کی حیثیت رکھتا ہے۔

انسان کی تمنا کے مقابلہ میں ''دشت امکاں'' واقعی بہت تنگ ہے کیوں کہ تمنا محض امکانات کی پابند نہیں۔ کل تک جو باتیں دائرہ امکانات سے باہر سمجھی جاتیں آج ممکنات بن چکی ہیں لیکن اسی مناسبت سے انسان کی تمناؤں میں بھی ترقی ہو رہی ہے اور ان کا افق دور سے دور تک ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً کچھ ہی سال پہلے جب تک ہوائی جہاز ایجاد نہیں ہوا تھا انسان ہوا میں اڑنے کی تمنا کرتا تھا لیکن اب جب کہ اڑنے لگا ہے تو وہ مریخ اور چاند پر پہنچ جانے کی تمنائیں کر رہا ہے۔ شاعر نے ''دشت امکاں'' کو ''تمنا کا نقش پا'' بہت خوب کہا ہے۔ تمنائیں ہمیشہ امکانات کو پیچھے چھوڑتی رہتی ہیں۔

وجاہت علی سندیلوی

(3) غالب کا خیال ہے کہ زندگی میں آرزومندی کا سفر کبھی ختم نہ ہونا چاہئے۔ ایک آرزو پوری ہو جائے تو دوسری آرزو کی منزل روشنی کے مینار کی طرح دور سے دکھائی دینے لگے جس کی طرف انسان بڑھتا رہے۔ جب منزل پر پہنچ گئے تو وہ رہرو کے نقش پا کی طرح ہو جاتی ہے۔ جب نقش پا کی طرح اس میں جمود پیدا ہو گیا تو دل اس پر کیسے رکھے! دل تو ہمیشہ تمناؤں کی نئی منزلوں کا خواہاں رہتا ہے۔ وہ دائمی حرکت چاہتا ہے۔ غالب دریافت کرتے ہیں کہ جب دشت امکاں نقش پا کے مثل ہے تو اب دیکھو تمنا اپنا دوسرا قدم کدھر اٹھاتی ہے۔ تمنا کے لئے دشت امکاں کے علاوہ اور دوسرے جہاں بھی ہیں جن کی تسخیر کے امکانات ہیں۔ دراصل تہذیب و تمدن کے انقلاب انسانی تمناؤں کی دائمی

تخلیق کے مظہر ہیں۔ انسان اپنی فطرت کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ نئے نئے مقاصد پیدا کرتا رہے۔ اس طرح وہ کائنات میں بے بس اور مجہول ہستی نہیں رہے گا بلکہ اپنی تمناؤں کی بدولت اپنے آپ کو نت نئے تجربوں میں الجھاتا رہے گا۔ جب دشت امکاں نقش پا کی طرح بے حرکت ہو گیا تو وہ اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ اب ہمارا دوسرا قدم کس عالم میں پڑے گا۔

یوسف حسین خاں

(4) ترقی یافتہ طبیعیات اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ زمین، سورج، چاند اور لاتعداد ستاروں کا مادہ ایک ہی ہے۔ اگرچہ اضافیت کے لحاظ سے اس مادّے کی صفات میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح نباتات کے عالم میں گوناگونی کے باوجود آئینی یکسانی موجود ہے جو اس عالم کو جمادات کے عالم سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی طرح حیوانات کا عالم اپنے لامتناہی تنوع کے باوجود ایک اساسی وحدتِ آئین میں منسلک ہے۔ اسی طرح محسوسات کے تمام عالم مل کر ایک یک رنگی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس شعر میں غالب نے خالق کے جذبۂ تخلیق کو ارتقائی قرار دیا ہے۔ تمنائے سرمدی ہمیشہ آگے کی طرف قدم بڑھاتی رہتی ہے۔ اس کا ایک قدم عالم کی آفرینش کا باعث ہوتا ہے۔ وہاں اپنا نقش قدم چھوڑ کر تمنائے تخلیق آگے بڑھتی اور دوسرا قدم اٹھاتی ہے۔ ایک نقش قدم ایک عالم کا اساسی قانون بن جاتا ہے اور اس عالم کے تمام مظاہر کی کثرت میں ایک مخصوص وحدت پیدا ہوتی ہے جو دوسرے عوالم کی دوسری قسم کی کثرتوں سے ایک الگ قسم کی ہوتی ہے۔ جمادات کا اساسی قانون نباتات سے الگ، نباتات کا حیوانات سے الگ اور انسانی زندگی کا بنیادی آئین ان دونوں سے جدا۔ اس امتیاز کے باوجود بھی یہ تمام عوالم مجموعی طور پر عالم امکان کہلاتے ہیں۔ اس کے محسوسات و مدرکات و معقولات سب زمان و مکان یا علت و معلول کے سانچوں سے باہر نکلتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے۔ غالب اس سارے عالم امکاں کو لامحدود تمنائے خلاقی کا ایک نقش قدم قرار دیتا ہے۔ طبیعی سائنس بھی اب اسے ایک نقش قدم ہی سمجھتی ہے۔ خاک اور فلک الافلاک سب کا اساسی سانچہ ایک ہی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ لامتناہی تمنائے تخلیق نے کوئی دوسرا قدم بھی ضرور اٹھایا ہوگا۔ جس نے ایک ایسا عالم پیدا کیا ہو جو عالم امکان کی طرح زمان و مکان کے سانچوں میں ڈھلا ہی نہ ہو۔

خلیفہ عبدالحکیم

نہیں گر، سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

(1) دریافتِ حقیقت کی قوت نہیں ہے تو تماشائے صورت ہی سہی۔

حسرت موہانی

(2) اگر معنی و باطن وحقیقت کے جاننے کا سامان نہیں ہے تو نہ سہی مشاہدہ نیرنگ صورت ہی سلامت رہے کہ اس کے تغیرات کے دیکھنے سے بھی فاعل اور جاعل تک ذہن کو ارسال ہوتی ہے۔ چاہے کنہ اور حقیقت نہ معلوم ہو۔ انقیاد وخضوع واقرار بالحق تو کم از کم حاصل ہوتا ہے۔

شاداں بلگرامی

(3) اگر ہم میں رازِ حقیقت دریافت کرنے کی قوت نہیں تو نہ سہی، اجسام ظاہر کا مطالعہ ہی ہمارے لئے کافی ہے کیوں کہ مجاز حقیقت کا زینہ ہے۔

آغا محمد باقر

(4) اگر انسان میں یہ صلاحیت نہ ہو کہ وہ حقیقت تک پہنچ سکے یا حقائق اشیاء کا علم حاصل کر سکے تو کم از کم اسے کائنات کے مظاہر ہی کا مشاہدہ کرنا چاہئے کیوں کہ مشاہدۂ فطرت بھی حقائق فطرت تک رہنمائی کے لئے کافی ہے۔

سلیم چشتی

(5) اگر حقیقت کو سمجھنے یا دریافت کرنے کی قوت وسامان نہیں تو نہ سہی۔ نیرنگ صورت یعنی اجسام ظاہری کا دیکھنا ہی غنیمت ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے۔

ملک محمد عنایت اللہ

(6) اگر تجھ کو دیدۂ حق بین نہیں ملا ہے یا تجھ میں اس کائنات کے باطن کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو

پھر جمالِ ظاہری ہی کو دیکھ، غور کر اور لطف اندوز ہو۔ تیرے لئے یہ بھی غنیمت ہے۔

شہاب الدین مصطفیٰ

(7) اگر حقائق کائنات کے باطنی مفاہیم تک رسائی ممکن نہیں ہے تو نہ سہی، ظاہری مظاہر کم دلکش نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اس قدر دلکش ہیں کہ فریب ہوتے ہوئے بھی ''تماشا'' (لمبی عرفان) کا حکم رکھتے ہیں۔ ان مظاہر کا فریب یہی ہے کہ وہ فریب ہوتے ہوئے بھی حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔ معنی تک پہنچنا ہر شخص کے بس میں نہیں، لیکن صورت تک پہنچنا تو ہر شخص کے بس میں ہوگا۔ اس طرح یہ شعر بیک وقت کائنات ناطق کا اقرار، اس کے مشکل الحصول ہونے پر دلالت اور مادی مظاہر وقعت اور Validity پر اصرار کرتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

(8) دنیا میں جو چیز یا جو مظہر بھی ہے اس کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک اس کے معنی۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ صورت سے معنی کی طرف یا ظاہر سے باطن کی طرف آیا جائے۔ لیکن صرف حکمت ہی انسانی فطرت کا تقاضا نہیں۔ اور انسان کا زندگی کے مختلف شعبوں سے جو تعلق ہے وہ کئی طرح کا ہوتا ہے۔ مثلاً عشق کا جو رابطہ ہے اس میں عقل و ادراک کا براہِ راست کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ انسان عام طور پر جن چیزوں سے لطف اٹھاتا ہے ان کی وہ کوئی عقلی توجیہ نہیں کرتا۔ جذبات اور تاثرات تعقل سے الگ بھی اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ محبت کرنے والے اس جذبے کی منطقی تحلیل نہیں کیا کرتے بلکہ انسانی تاثرات کی یہ ایک عجیب خصوصیت ہے کہ اگر ان میں معنی ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش تاثر کی کیفیت کو یا بالکل فنا کر دیتی ہے یا اسے بدل دیتی ہے۔ ذوقِ جمال میں کوئی استدلال نہیں ہوتا۔ جو شخص موسیقی سے لطف اٹھا رہا ہے وہ اس میں کوئی معنی تلاش نہیں کر رہا ہے۔ خالص موسیقی میں خواہ وہ ساز سے نکل رہی ہو یا انسانی آواز سے، کوئی الفاظ نہیں ہوتے۔ جہاں الفاظ نہیں وہاں معنی کہاں سے آئیں گے۔ کیوں کہ نفسِ انسانی میں تاثرات تو بے الفاظ ہوتے ہیں لیکن معانی الفاظ کا جامہ پہنے بغیر فضائے نفس میں بھی جلوہ گر نہیں ہوتے۔ ادراکِ معنی کا سر و برگ یا ساز و سامان ہر شخص کے پاس نہیں ہوتا۔ اس کی کمی یا فقدان سے یہ تو ضرور ہے کہ انسانی فطرت کا ایک اہم پہلو بروئے کار نہیں آیا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انسان دوسری حیثیتوں سے بھی معرا ہو گیا

ہے۔ بہت سے لوگ طب اور وظائفِ اعضاء کے علم سے ناواقف ہونے پر بھی بعض طبیبوں سے مقابلے میں زیادہ تندرست ہوتے ہیں۔ اسی طرح جاننے کے بغیر بھی بعض لوگ فصیح البیان ہوتے ہیں۔ اسی طرح عقلی طور پر شاعری کی ماہیت سے ناواقف ہونے پر بھی اچھے خاصے شاعر ہو سکتے ہیں غرض زندگی کے بہت سے افعال واعمال ہیں جن کے لئے سرو برگِ ادراک معنی ایک لازمی شرط نہیں محض نیرنگِ صورت کا تماشا فقط ذوقِ جمال ہی کی تسکین نہیں کرتا۔ بلکہ اور کئی طرح حیات افزا ہوسکتا ہے۔ بغیر ادراکِ معنی کے 'موسیقی' جو محض سُروں کا تناسب ہے غذائے روح بن جاتی ہے۔ صوت کے لحاظ سے یہ محض نیرنگِ صوت ہے۔ لیکن بڑی مبارک صورت ہے۔ صورت اگر معنی نے بنائی ہے تو محض بحیثیت صورت بھی وہ بے معنی نہیں ہوسکتی۔ خواہ معنی کا براہِ راست ادراک نہ کیا جائے۔

غرض تماشائے نیرنگِ صورت بھی ایسی سرسری اور سطحی چیز نہیں کہ معنویت کے مقابلے میں اسے بالکل بے قیمت سمجھ لیا جائے۔ مصوری جو تماشائے نیرنگِ صورت سے پیدا ہوتی ہے ایک اعلیٰ درجے کا فنِ لطیف ہے۔ دیگر فنونِ لطیفہ بھی جن کا وظیفہ حسن پسندی، حسن پروری اور حسن کاری ہے زیادہ تر نیرنگِ صورت ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ انسان کی تہذیب و تربیت میں حکمت واخلاق کے علاوہ ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ غالب خود ایک فنِ لطیف کا ماہر ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ سرو برگِ ادراکِ معنی بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس کی طبعیت میں شعریت مقدم ہے اور حکمت موخر۔ وہ معنی اور صورت دونوں سے لطف حاصل کرسکتا ہے۔ وہ موازنہ اور مقابلہ کرسکتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ ہر شخص ادراکِ معنی کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ اور نہ ہر شخص کے لئے ہر وقت اور ہر حیثیت میں ادراکِ معنی ہی ضروری چیز ہے۔ اسی لئے کہتا ہے کہ اگر ادراکِ معنی کی قوت کسی میں نہیں یا کسی وقت نہیں تو نہ سہی، زندگی اور اقدار بھی رکھتی ہے۔ تماشائے نیرنگِ صورت بھی ایک اعلیٰ درجے کا روح پرور شغل ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

(1) جب میں مرزا غالب کی طبیعیات الہیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ یہ فلکیات کی ایک جدید ترین تحقیقات خیال کی جاتی ہے جو مشاہدہ سے زیادہ ریاضی کے تخمینوں پر مبنی ہے کہ اگر ہم فضائے سماوی کے سب سے آخری ستارے اور سیارے تک پہنچ جائیں تو وہاں سے آگے بھی ویسے ہی ستارے اور سیارے نظام ہائے شمسی قنوان وغیرہ موجود ہیں۔ آباد فضا بھی بے اندازہ ہے اور خلاء اثیر کہاں شروع اور کہاں ختم ہوتا ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری

(2) غالب کو عقلی یا وجدانی طور پر اس کا بھی احساس تھا کہ فضائے بسیط سے اس طرف اور بھی سیارے موجود ہیں، جہاں حیات اسی طرح ارتقاء پذیر ہوسکتی ہے جیسے کہ کرۂ زمین پر۔

اسلوب احمد انصاری

(3) جغرافیہ کے محققین نے جو مقامات دریافت کیے ہیں، ان میں سب سے بلند مقام کا نام عرش ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ شوق تحقیق یعنی عشق نے منازل طئے کر کے یہاں تک تو پہنچا دیا۔ اگر اس سے بھی کوئی اعلیٰ مقام دریافت ہوجائے تو عرش سے اٹھ کر وہاں ایک مسکن بنالیں گے۔ عرش پر پہنچ کر بھی شوقِ ارتقاء مفقود نہیں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ فنا فی اللہ کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا ہوں پھر بھی شوق باقی ہے۔

شہاب الدین مصطفیٰ

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

(1) یہ ستارے حقیقۃ ہیں کچھ اور دکھائی کچھ دیتے ہیں۔ بڑے ہیں، چھوٹے دیکھنے میں نظر آتے ہیں۔ متحرک نہیں مگر متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ مختلف رنگ کے ہیں۔ مگر متشابہ نظر آتے ہیں۔

شاداں بلگرامی

(2) کواکب یعنی ستارے۔ اصل میں کچھ ہیں اور نظر کچھ اور آتے ہیں۔ گویا بازیگر ہیں جو ہمیں کھلا دھوکا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ستارے ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ لیکن ہمیں قریب قریب نظر آتے ہیں۔ اکثر ستارے بے نور ہیں لیکن سورج کی چمک سے منور ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیارے، ستارے معلوم ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بس یہی کھلا ہوا دھوکا ہے۔

آغا محمد باقر

(3) غالبؔ کو ستاروں اور ان کی ماہیئت کا کافی علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ستارے محض ''سامانِ آرائش'' نہیں بلکہ ان میں سے بعض سورج سے دس گنا بڑے ہیں اور بعض میں ہماری دنیا کی طرح لوگ آباد ہیں۔ لیکن بادی النظر میں وہ چھوٹے چھوٹے شرارے نظر آتے ہیں جو دن کے وقت غائب ہو جاتے ہیں۔

احمد الدین مارہروی

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

(1) مرزا نے اپنے ممدوح کو ایک ایسے کمال کے ساتھ موصوف کیا ہے، جو تمام کمالات کی جڑ ہے یعنی وہ ہر چیز کو کامل تر اور افضل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے، اس لئے ہر شئے اپنے تئیں کامل تر حالت میں اس کو دکھانا چاہتی ہے اور اس سے نتیجہ نکالا کہ اگر یہی حال ہے تو شائد آسمان کی زیب و زینت کے لئے اور ستارے پیدا کئے جائیں۔

حالی

(2) اس کا عہد ایسا مبارک ہے کہ ساری کائنات محو آرائش ہے یعنی اپنے حسن و جمال میں اضافہ کررہی ہے اس لئے آسمان کی آرائش کے لئے بھی اب نئے ستارے بنائیں جائیں گے کیوں کہ یہ ستارے تو پرانے ہو چکے ہیں۔

سلیم چشتی

(3) اس کے عہد حکومت میں دنیا کی آرائش و زیبائش ہو رہی ہے۔ اس لئے آسمان کو زیادہ خوشنما بنانے کے لئے اور ستاروں کی ضرورت ہے۔ ممدوح کی خاطر اب بنائے جائیں گے۔

شہاب الدین مصطفیٰ

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

(1) سورج کو، اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادہ زوال و فنا ہیں۔ چراغ رہگذار باد سے تشبیہہ دی ہے، جو بالکل نئی تشبیہہ ہے۔

حالی

(2) غالب کو تصوف سے شغف تھا اور گہرا شغف تھا۔ اس کی دلیل ان کے مکتوبات ہی میں جگہ جگہ موجود ہے۔ اسی بنا پر اکثر شراح غالب کے مابعد الطبیعیاتی اشعار میں تصوف تلاش کرتے ہیں۔ اس شعر کا مضمون تصوف پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس میں جدید سائنسی مادیت کا سا رنگ ہے۔
غالب کے غیر معمولی وجدانی علم نے جہاں ان سے بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا اور ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب جیسے شعر کہلائے، وہاں یہ شعر بھی کہلوالیا جس کی بنیاد ایک ایسی سائنسی حقیقت پر ہے جس کی خبر اس زمانے میں اہل مشرق و مغرب کو نہ تھی۔

شمس الرحمٰن فاروقی

(3) کائنات کا ہر ذرّہ آمادۂ زوال ہے۔ یہاں تک کہ خورشید بھی ایک ایسا چراغ ہے جو ہوا کے راستے میں روشن ہے اور اس کا آمادۂ زوال ہونا ظاہر ہے۔ کیا پتہ کون سا جھونکا اسے فنا کر دے۔

آغا محمد باقر

(4) جملہ کائنات مجموعی طور پر اور اس کے اجزاء انفرادی حیثیت سے زوال پذیر اور فانی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً انسان، حیوان، نباتات وغیرہ کا زوال پذیر ہونا اور فنا ہونا تو روزانہ مشاہدہ کیا جاتا ہے اس لئے کہ ان کی عمریں چھوٹی ہیں۔ اور جن اجزائے کائنات کو خالق نے طویل عمریں بخشی ہیں، ان کی زوال پذیری کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ وہ بھی اس عام کلیہ سے کہ ''فنائیت سب کے لئے عام ہے''، نہیں بچ سکتے۔ پس ہم بآسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آفتاب بھی جو نظام شمسی کا سب سے

بڑا جز ہے کسی نہ کسی روز فنا ہوگا۔ ہوا کے راستہ کا چراغ ہے جو گل ہو کر رہے گا۔

شہاب الدین مصطفیٰ

پیکرِ عشّاق سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہے

(1) فیثا غورس، جس نے اپنے فلسفے کی بنیاد ریاضیات پر رکھی، یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ سیاروں کی گردش میں نغمے نکلتے ہیں۔ موسیقی اور علم ہئیت دونوں ریاضیات سے وابستہ ہیں۔ سازوں کے تار پیمائش اور حساب سے بنتے ہیں۔ اعداد اور پیمائش کا تناسب ساز کے ارتعاش میں نمودار ہوتا ہے۔ جس سے موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ فیثا غورس کہتا تھا کہ سیاروں کی حرکت بھی ریاضیاتی تناسب کے مطابق ہوتی ہے۔ جس طرح تناسب سے ساز کے تاروں کی حرکت نغمہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح سیاروں کی گردش بھی نغمہ آفرینی کرتی ہے۔ علم نجوم کے لحاظ سے بعض ستارے سعد اور سازگار ہوتے ہیں اور بعض نحس و ناساز۔ اگر ہر طالع میں سے آواز نکلنی ضروری ہے تو غالبؔ کہتا ہے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عاشقوں کے اندر سے ہمیشہ نالے ہی کیوں نکلتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیکر طالع ناساز کے ساز ہیں۔ طالع ناساز گردش کرتا ہے تو اس میں سے نغمے کے بجائے نالہ نکلتا ہے۔ فیثا غورس کے نظریے میں سے کیا مضمون پیدا کیا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم

(2) کہتے ہیں کہ فیثا غورث نے علم موسیقی ستاروں کی حرکت کی آواز سے ایجاد کیا ہے۔ جسم عشاق بخت ناسازگار عاشقان کا ایک باجہ ہے اور نالہ ہائے عشاق گویا گردش سیارگان کی آواز ہے۔ اس وجہ سے گردش سیارگان و طالع ناساز ہی تو موجب نالہ وفریاد ہیں۔ ہر حرکت میں آواز ہوئی ہے۔ سنائی دے یا نہ سنائی دے۔ جس طرح گردش سیارگان کی آواز غیر مفید ہے اسی طرح نالہ وفریاد بھی غیر مفید ہے۔

شاداں بلگرامی

(3) جدید علم الافلاک کی رو سے کائنات لامتناہی ہے یا کم سے کم اتنی وسیع ہے کہ بڑی بڑی کہکشائیں اور عظیم الشان ستاروں کے جھرمٹ اس میں گم ہیں، یعنی وہ ایک دوسرے سے اتنی دور ہیں کہ اکثر کے درمیان کا فاصلہ انسان کے تصور سے بھی ماورا ہے۔ غالب کے زمانے میں یہ دریافتیں ابھی کتمِ عدم میں تھیں، لیکن ان کے وہبی وِجدانی علم نے حسب معمول ان حقائق تک رسائی کرلی جو ابھی کسی کی دسترس میں نہ تھے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

(1) میں عیش ونشاط طرب سے کچھ تعلق نہیں رکھتا ہوں اور اپنی مصیبت میں ایڑی چوٹی تک گرفتار ہوں۔ بلکہ شکستہ دلی کی آواز ہوں۔

شاداں بلگرامی

(2) نہ میں خوشی کی آواز ہوں اور نہ پردۂ ساز ہوں۔ میں درحقیقت اپنی شکست کی آواز ہوں جو سراپا درد ہے۔ مجھے عیش وطرب سے کوئی تعلق نہیں۔

محمد عنایت اللہ

(3) نہ تو میں گلبانگ ہوں اور نہ پردہ ساز ہوں بلکہ میں اپنی شکست کی آواز ہوں جو سراپا درد ہے۔ گویا خوشی کے نغموں سے مجھے کوئی واسطہ نہیں۔ میری آواز میرے دل کے ٹوٹنے کی آواز ہے۔

آغا محمد باقر

(4) شاعر زندگی کی رکاوٹوں سے جب شکست کھاتا ہے تو شکست کی آواز شعر بن جاتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاعر اس شکست سے شکستہ دل ہو کر یاس کے بھنور میں غرق ہو جائے۔ وہ رکاوٹوں کے مقابلے کے لئے امید افزا اور ہمت آفریں تصورات اور تاثرات بھی پیدا کرسکتا ہے۔ تسکین کے سامان تیار کرنا یہ بھی اس کی فطرت اور اس کے فن کا ایک جزو ہے۔ لیکن اس قسم کی سخن آفرینی کے لئے بھی مقدم یہ ہے کہ زندگی نے اس کی تمناؤں کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ڈالی ہوں۔ رکاوٹیں جس قدر زیادہ ہوں گی اسی قدر وہ ان پر غالب آنے کے لئے جذبات کو ابھارے گا۔ شاعری بھی زندگی کے اس عام اصول کے ماتحت ہے کہ اگر رکاوٹیں نہ ہوں تو حیات انسانی میں کوئی ترقی نہ ہو۔

خلیفہ عبدالحکیم

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

(1) تو اگر پانی سے قوت روانی کو چھین لے اور تو آتش سے اگر قوت جلانے کی دور کردے تو موجہ دریا میں روانی کا ڈھونڈے سے بھی پتہ نہ لگے۔ اور جلانے کی آگ میں سوزش باقی نہ رہے۔

شاداں بلگرامی

(2) اگر تو پانی سے بہنے والی طاقت سلب کرلے تو دریا کی موجوں سے روانی مفقود ہو جائے اور اگر آگ سے نقصان پہنچانے کی طاقت دفع کرے تو اس میں حرارت ناپید ہو جائے۔

سلیم چشتی

(3) اگر تو پانی کے بہنے کی طاقت دفع کردے تو دریا کی موجوں میں روانی ڈھونڈے نہ ملے اور اگر تو آگ کی حرارت سلب کردے تو جلا دینے والی آگ میں حرارت نام کو باقی نہ رہے۔

آغا محمد باقر

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

(1) میں ایسا گرم رفتار ہوں کہ میرے نقش قدم میں اب تک وہ گرمی ہے جس سے میدانِ دشت کاغذ آتش زدہ بنا ہوا ہے۔

نظامی بدایونی

(2) میرے نقش قدم میں گرمی رفتار کی تپش اب بھی اتنی باقی ہے کہ اس نے صحرا کو کاغذ کی طرح جلا کر رکھ دیا۔

نیاز فتح پوری

(3) ہمارے نقش قدم میں گرمئی رفتار کا بخار ہنوز باقی ہے جس سے صفحۂ دشت یکسر کاغذ آتش زدہ کے مانند جل رہا ہے۔

حسرت موہانی

(4) میرے نشان قدم میں میری گرمئی رفتار سے حرارت اب بھی ہے جس سے صحرا بالکل کاغذ آتش زدہ کی طرح جل رہا ہے۔

شاداں بلگرامی

(5) میرے نقش پا میں گرمئی رفتار کا ابھی تک اتنا اثر ہے کہ دشت سراسر کاغذ آتش زدہ کی مانند نظر آتا ہے یعنی تاثیر تپ سے سارا جنگل جل گیا۔

سلیم چشتی

(6) میری گرمئی رفتار کی تپش میرے نقش پا میں ابھی تک اتنی زیادہ باقی ہے کہ اس کے اثر سے تمام صفحۂ دشت کاغذِ آتش زدہ کی طرح جل رہا ہے اور پیچ و تاب کھا رہا ہے۔

آغا محمد باقر

خارہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منتے برقدمِ راہ روان است مرا

(1) راہ کے تمام خاروخس میری گرم رفتاری سے جل گئے ہیں پس رہگیروں کے قدم پر میرا احسان ہے کہ میں نے ان کے لئے رستہ بالکل صاف کر دیا۔

حالؔی

(2) انسان کی ورزشِ ارتقاء اور امتحانِ ہمت کے لئے فطرت نے اس کے اندر اور باہر مشکلیں اور رکاوٹیں ڈال رکھی ہیں۔ علم و عمل میں کمال رکھنے اور زندگی کو آگے بڑھانے والے اربابِ کمال اپنی کوششوں سے کچھ زحمتوں اور مزاحمتوں کو دور کرتے چلے جاتے ہیں۔ بعد میں آنے والی نسلوں کو ایسے لوگوں کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ ان کی گرمی رفتار سے راستے کے اکثر کانٹے سوخت ہو گئے اور طریق ارتقاء کا کچھ حصّہ صاف ہو گیا۔

خلیفہ عبدالحکیم

(3) غالبؔ کی خصوصیت جدت ہے۔ وہ دوسروں کی چلی ہوئی راہ پر چلنے کے بجائے اپنی راہ الگ نکالنا چاہتا ہے۔ چاہے نئی راہ میں کانٹے کیوں نہ ہوں لیکن اسی پر چلنا چاہیئے۔ حوصلہ مندی کا تقاضہ ہے کہ اپنی گرمیٔ رفتار سے کانٹوں کو جلا ڈالے، تاکہ آئندہ جو لوگ اس راہ پر چلیں انھیں زحمت نہ گوارہ کرنی پڑے۔

یوسف حسین خاں

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

(1) میرے دل کی تپش خوفِ عظیم سے خالی نہیں ہے اور میرے لئے سانس کا کھینچنا جرثقیل کی کشش سے کم نہیں ہے۔

نظامی بدایونی

(2) تپشِ دل میرے لئے خوفِ عظیم ہے اور سانس لینا جرثقیل سے کم نہیں۔

حسرت موہانی

(3) دل کی تپش خوف عظیم سے خالی نہیں۔ اور سانس کا لینا میرے لئے جرثقیل سے کم نہیں۔

نظم طباطبائی

(4) میرے دل کی تڑپ بغیر خوف کے باقی نہیں رہی۔ میرے دل میں حرکت بغیر خوفِ عظیم کے ہوتی ہی نہیں اور میرا دم لینا بغیر امداد جرثقیل مشکل ہے۔

عبدالقادر آسی

(5) دل کے اضطراب کا تعلق بڑے خطرے سے ہے یعنی ہلاک کر دے گا۔ اور سانس جو لیتا ہوں بڑی مشکل سے لے سکتا ہوں۔ لفظ کشش نفس (سانس) اور جرثقیل دونوں سے مناسب ہے۔ (جر ثقیل ایک آلہ ہے جس سے بھاری بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اردو میں بالاگّی کہتے ہیں)

شاداں بلگرامی

(6) جرثقیل ایک علم ہے جس میں بھاری چیزوں کے اٹھانے کے قاعدے بتلائے جاتے ہیں۔ تپش دل میرے لئے خوفِ عظیم کا باعث ہے اور سانس لینا بغیر جرثقیل سے کم نہیں۔

آغا محمد باقر

(7) دل کی حرکت اور بے قراری کا تعلق خوف عظیم سے ہے۔ اور سانس بغیر جر ثقیل کی مدد کے نہیں کھینچ سکتے یعنی سانس لینا بھی مشکل ہو گیا ہے۔

شہاب الدین مصطفیٰ

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

(1) نالہ سے ناچار ہے فارسی محاورہ ''از نالہ چارہ ندارد'' کا ترجمہ ہے۔ یعنی آگ بھی جس کی خاموشی مسلم ہے درماندگی میں چیخ اٹھتی ہے۔

نظامی بدایونی

(2) چوں کہ جلنا آگ کا خاصہ ہے اس لئے جب اسے پانی سے بجھاتے ہیں یعنی اسے فنا کرتے ہیں تو اس میں سے آواز نکلتی ہے۔ یعنی وہ اپنی درماندگی کی وجہ سے نالہ وفریاد پر مجبور ہو جاتی ہے کیوں کہ کوئی شئے اپنی فنا پر رضامند نہیں ہو سکتی۔

سلیم چشتی

(3) آگ جیسی خاموش یا ظالم وغضبناک چیز بھی جب اُسے پانی کے ذریعہ فنا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اپنی اس مصیبت کی حالت میں فریاد کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ آگ کو جب پانی سے بجھایا جائے تو اس وقت ایک آواز نکلتی ہے جسے نالہ سے تعبیر کیا ہے۔

محمد عنایت اللہ

(4) شاعر کے دل میں یہ خیال ہے کہ آگ خاموشی سے جلتی ہے۔ لیکن جب اس کو پانی میں ڈال کر بجھاتے ہیں تو اس میں بجھنے کی آواز پیدا ہوتی ہے وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ درماندگی کی حالت میں انسان کے منہ سے نالہ نکل ہی جاتا ہے۔ دیکھ لو آگ جیسی خاموش جلنے والی چیز بھی اس حالت میں خاموش نہیں رہ سکتی۔

آغا محمد باقر

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

(1) بادِ بہاری کو بسبب لطافت کے آئینۂ فولادی قرار دیا ہے۔ چوں کہ آئینۂ فولادی پر زنگ آتا ہے اور زنگ سبز رنگ کا ہوتا ہے۔ لہٰذا چمن کو جو باعتبار برگ اشجار کے سبز ہوتا ہے، آئینہ بادِ بہاری کا زنگ مقرر کیا ہے اور چوں کہ بادِ بہاری لطیف چیز ہے اور بمقابل اس کے برگ اشجار کثیف شئے ہے۔ لہٰذا یہ نتیجہ نکالا کہ لطافت بغیر کثافت کے حاصل ہو نہیں سکتی۔ مطلب یہ کہ جیسے دنیا میں غم و شادی توام ہیں اسی طرح لطافت و کثافت کا حال اور وہ بھی توام ہیں۔

عبدالولی والہ

(2) بغیر کثافت کے لطافت جلوہ گر نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ بے تعلق مادہ جلوۂ مجردات نہیں ہو سکتا۔ دوسرے مصرعہ میں اس بیان کا مثالی ثبوت دیا گیا ہے یعنی بادِ بہاری کے جلوے کے نمودار ہونے کا چمن ہی ذریعہ ہوتا ہے۔

نظامی بدایونی

(3) اس میں ایک ایسا اصول بیان کیا گیا ہے جو حیات و کائنات کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ دنیا میں بعض چیزیں لطیف اور بعض ان کے مقابلے میں کثیف۔ یا یوں کہیے کہ ہر چیز کے دو پہلو ہیں۔ ایک لطیف اور دوسرا کثیف۔ کوئی مادی چیز لے لیجیے۔ ٹھوس مادہ ہونے کی وجہ سے وہ کثیف ہے۔ لیکن اگر اس میں رنگ یا بو ہے، یہ دونوں لطیف چیزیں ہیں جو اسی کثیف مادے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لکڑی ایک کثیف مادہ ہے۔ لیکن جب اسے جلائیں تو اس میں سے جو شعلۂ بے دود نکلے گا وہ لطیف ہوگا۔ اگر آگ کے ساتھ دھواں بھی ہے تو دھواں کثیف ہے اور اس کے مقابلے میں آگ لطیف ہے۔ اسی طرح چراغ کو لیجیے۔ اس میں تیل اور بتی دونوں کثیف مادہ ہیں لیکن جلنے پر جو نور اس میں سے نکلتا ہے وہ ایک جوہر لطیف ہے۔ انسان جسم و روح کے ایک مرکب کا نام ہے۔ اس کا جسم کثیف ہے اور اس کی روح لطیف۔ غرض عالم موجودات میں جہاں بھی دیکھیے لطافت و کثافت کی آمیزش نظر آتی

ہے۔حسن ایک لطیف ترین شئے ہے لیکن ہر حسن کسی وجود کا حسن ہوگا اور وجود اپنے حسن کے مقابلے میں کثیف ہوگا۔لطافت اور کثافت کے باہمی تعلق پر حکما نے بہت طبع آزمائی کی ہے۔

غالب کہتا ہے کہ خالی لطافت ہی ہوتی تو وہ وجود پذیر نہ ہوسکتی تھی۔یعنی بغیر مدد کثافت وہ خود کوئی جلوہ پیدا نہ کرسکتی۔اس کی مثال وہ یہ دیتا ہے کہ چمن یعنی گلبن واشجار اور برگ و بار بادِ بہاری کے مقابلے میں کثیف ہیں۔بادِ بہاری کو صاف وشفاف ہونے کی وجہ سے اگر آئینے سے تشبیہ دیں تو چمن کی یہ ساری سبزی اس آئینے پر ایک طرح کے زنگ کے مماثل ہے۔لیکن اگر یہ زنگ نہ ہوتا تو چمن میں کوئی رنگ نہ ہوتا۔خالی لطافت بادِ بہاری سے چمن کا وجود ہی نہ ہوتا۔کثافت لطافت کے لئے ایک لازمی ذریعۂ اظہار ہے۔لطافت کی قدر دانی میں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ جلوہ آفرینی کے لئے ہر جگہ کثافت کی رہینِ منّت ہے۔طبیعی بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ نورِ محض غیر مرئی ہے۔یعنی دکھائی دینے کی چیز نہیں۔روشنی جب تک کسی کثیف چیز پر نہ پڑے وہ دکھائی نہیں دے سکتی۔یہ بات ذرا جلد سمجھ میں نہیں آتی لیکن حقیقت یہی ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ ہم روشنی دیکھتے ہیں لیکن حقیقت میں روشنی پڑنے سے ہم وہ چیزیں دیکھتے ہیں جن پر روشنی پڑتی ہے۔نور جو مادی دنیا میں لطیف ترین شئے ہے۔وہ ازروئے طبیعیات مادّے کی کثافت کے واسطے کے بغیر کوئی جلوہ پیدا نہیں کرسکتا۔اسی طرح غذا کو لیجئے۔غذا میں کچھ کثیف حصّے ہوتے ہیں اور کچھ لطیف۔معدے کے عملِ انہضام میں یہ ہوتا ہے کہ مقابلتہً لطیف جوہر الگ ہوکر خون میں مل کر جزوِ بدن بن جاتے ہیں۔اور کثیف اجزا آنتوں کے راستے سے ہوتے ہوئے خارج ہوجاتے ہیں۔اگر کوئی انسان ان لطیف جوہروں کو کیمیائی عمل سے الگ کرنا چاہے، اول تو اس میں پوری کامیابی نہیں ہوسکتی۔لیکن جہاں تک الگ ہوسکتے ہیں وہ براہِ راست جسم کی بقا کے لئے کام نہیں آسکتے۔فطرت نے غذا کا یہی اصول رکھا ہے کہ اس کی لطافت کثافت کے بغیر بقائے حیات کی ضامن نہیں ہوسکتی۔

ماہر طبیعیات اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کائنات مادی کی اساسی حقیقت ماس اور انرجی ہے۔ یا مادّے کی کثیف صورت اور اس کی طاقت۔ماس کثیف ہے اور انرجی لطیف۔مادہ کثیف انرجی میں تبدیل ہوسکتا ہے۔لیکن اگر خالی انرجی ہوتی تو کائنات کا وجود نہ ہوتا۔وجود کے لئے ضروری ہے کہ انرجی کی لطافت کی آمیزش مادّے کی اس کثیف صورت کے ساتھ ہو جسے ماس کہتے ہیں۔تمام مجرد تصورات لطیف ہیں، لیکن خالی مجرد تصورات سے کوئی وجود نہیں بنتا۔غالبؔ نے اس شعر میں ایک ایسا

کلیہ بیان کیا ہے جو موجودات کے ہر شعبے پر قابلِ اطلاق ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم

(4) نہایت سادہ الفاظ، دل نشیں پیرایہ اور لطیف تمثیل کے ذریعہ وحدۃ الوجود کا مسئلہ پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لطافت غیر مرئی اور غیر محسوس چیز ہے۔ تاوقتیکہ اس میں کثافت نہ پیدا ہو وہ ظاہر نہیں ہوتی۔ بھاپ غیر مرئی اور لطیف ہے۔ کثیف ہونے کے بعد ابر، پانی اور اولے کی شکل میں نظر آتی ہے اسی طرح موجوداتِ عالم کی اصل بھی غیر مرئی اور لطیف ہے۔ یہ ظاہری صور و اشکال اسی لطافت کی کثافت ہیں۔ بادِ بہاری غیر مرئی ہے اس کی صفائی و لطافت کی وجہ آئینہ سے تشبیہہ دی ہے۔ آئینہ نم ہو کر زنگ آلود اور کثیف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بادِ بہاری بھی زنگ آلود ہو کر چمن کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

شہاب الدین مصطفیٰ

(5) جب کسی شیشے کی ایک طرف گہری تہہ جما دی جاتی ہے تو اس کی دوسری طرف آئینے کی وہ چمک دکھائی دینے لگتی ہے۔ غالب کو پھولوں اور پتوں سے دلکش اور شوخ رنگوں میں وہ تہہ نظر آتی ہے، جس کے سہارے اور پردے میں ایثری اور غیر مرئی روحِ بہار جھلکنے لگتی ہے۔

فراق گورکھپوری

(6) قاعدہ ہے کہ لطافت بغیر کثافت کے جلوہ گر نہیں ہوتی۔ یعنی مجردات بغیر مادہ کی آمیزش کے ظاہر نہیں ہوتے۔ مثلاً بادی لطافت ہے۔ اس لئے اس کا جلوہ بھی چمن ہی کے ذریعہ سے نمودار ہوا۔ کہتا ہے چمن اپنی سبزی کی وجہ سے آئینہ بادِ بہاری کا زنگار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چمن کی کثافت (زنگار چمن) کے بغیر لطافت بادِ بہار جلوہ گر نہیں ہو سکی۔ مطلب یہ ہے لطافت و کثافت لازم و ملزوم ہیں۔

آغا محمد باقر

(7) کائنات کی کثیف اشیاء آئینۂ فطرت کے لئے قلعی کا کام دے رہی ہیں۔ آئینہ پر جب تک قلعی نہ کی جائے اس وقت تک اس میں پوری طرح انعکاس نہیں ہوتا۔ ہر انعکاس کے لئے ایک کثافت کا

بطور پس منظر ہونا ضروری ہے۔آفتاب کی شعاعیں فضائے آسمانی میں تیرتی ہوئی نظر نہیں آتیں جب تک کہ زمین یا اور کسی کثیف جسم پر پڑ کر مستنیر نہ ہوں۔

شوکت سبزواری

(8) یہ علم طبیعیات کی ایک حقیقت ہے کہ لطافت بے کثافت جلوہ گر نہیں ہو سکتی مثلاً روشنی کی شعاعیں نظر نہیں آتیں جب تک وہ کسی کثیف مادہ پر پڑ کر منتشر نہ ہوں ، اس حقیقت کو غالبؔ نے شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے اور مثال کے طور پر کہا ہے کہ لطافت آئینہ بہار بغیر کثافت زنگار چمن اپنا جلوہ نہیں دکھا سکتی۔

احمد رضا

(9) لطافت بغیر کثافت جلوہ افروز نہیں ہو سکتی۔ دوسرے مصرعہ میں تمثیل کے طور پر باد بہاری کے آئینے کو پیش کرتے ہیں جس کے لئے چمن کے برگ و بار زنگ کا کام دیتے ہیں۔ جس طرح بغیر زنگ کے جو پشت پر ہوتا ہے، آئینہ روشن نہیں ہوتا اسی طرح بغیر چمن کے بہار اپنا جلوہ نہیں دکھا سکتی۔ دنیا میں سب سے زیادہ لطیف شئے روشنی ہے۔ ہم روشنی کو تجریدی شکل میں نہیں دیکھتے بلکہ عالم کی مختلف اشیاء کے توسط سے وہ ہمیں نظر آتی ہے۔ راستے یا چمن یا مکان پر سورج کی کرنیں کھیلتی ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہاں روشنی ہے۔ بغیر خارجی اشیاء کے ہم روشنی کا تصور نہیں کر سکتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے جو ایک لطیفۂ نورانی ہے۔ بغیر جسم کے روح کا تصور نہیں کر سکتے۔ غرض کہ عالم میں لطافت اور کثافت ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ و پیوستہ ہیں۔

یوسف حسین خاں

ہوگئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

(1) اگر کسی روزن میں سے دھوپ آئے تو دھوپ کے ساتھ لاتعداد ذرّات آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس واقعہ کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں کہ اس کے گھر کی دیواروں کے روزنوں میں سے جو ذرّات اس کے مکان کے اندر آرہے ہیں۔ یہ ذرّات نہیں ہیں بلکہ نگاہِ آفتاب کے اجزاء ہیں جو محبوب کے دیکھنے کے لئے ہجوم کرکے آرہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آفتاب تک کو تجھے دیکھنے کا شوق ہے۔ اسی لئے وہ روزن دیوار میں سے جھانکتا ہے۔

آغا محمد باقر

(2) محبوب کی دیواروں کے روزنوں میں جو ذرّے نظر آرہے ہیں حقیقت میں یہ ذرّے نہیں ہیں بلکہ نگاہ آفتاب کے منتشر اجزاء ہیں جو ان روزنوں میں آکر جمع ہوگئے ہیں یعنی آفتاب بھی اس حسین پردہ نشین کو روزن دیوار سے تاکتا جھانکتا ہے۔

محمد عنایت اللہ

(3) ذرّے کو نگاہ آفتاب سے تعبیر کرنا شاعر کی رفعت تخیل کی دلیل ہے۔ مراد ہے کہ آفتاب بھی مشتاق دید ہے۔

اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں جو ذرّات نظر آتے ہیں یہ ذرّات نہیں ہیں بلکہ اجزائے نگاہ آفتاب ہیں یعنی آفتاب کو بھی اسے جھانک کر دیکھنے کی آرزو ہے۔

سلیم چشتی

(4) دیواروں کے روزن سے گذرنے والے ذروں کو اجزائے نگاہِ آفتاب کہنا غالبؔ ہی کا کام تھا۔ غالبؔ نے اپنے جمالیاتی 'ویژن' کی اس تصویر کو قاری کے لئے محسوس بنادیا۔

شکیل الرحمٰن

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَر افشاں جوہرِ آئینہ مثلِ ذرّہ روزن میں

(1) جولوگ علم مناظر ومرایا سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی ذرّہ کو کسی روزن میں آنکھ لگا کر دیکھا جائے تو ذرہ کے بے مقدار جسم سے ہر سمت شعاعیں نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔اس کا باعث آفتاب کی روشنی ہے جس کے عکس سے ذرّہ کا جسم خارجا روشن ہو جاتا ہے۔ یہ شعاعیں بعینہ ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے۔مرزا غالب اس کو ذرّہ کا پرافشاں ہونا کہتے ہیں۔

سوال ہے کہ مرزا کے وقت میں تو کیا اس زمانے میں بھی جب کہ انکسار اور انعکاس کے مسائل زبان زدعام ہیں کتنے اشخاص ایسے ہیں جو اس کیفیت سے واقف ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری

(2) جس طرح روزن پر آفتاب کی روشنی پڑنے سے ذرّات پرافشاں اور متحرک ہو جاتے ہیں اسی طرح اُس مہروش کے عکس رُخ کے سامنے آئینے کے جوہر اڑنے لگتے ہیں گویا اس کے عکس رُخ کے سامنے آئینہ ماند پڑ جاتا ہے۔

آغا محمد باقر

(3) جس طرح شعاع آفتاب سے روزن میں ذرّات پرافشاں (متحرک) ہو جاتے ہیں اسی طرح اس مہروش کے عکس رُخ کے آگے (یعنی اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر) آئینہ فولادی کے جوہر پر افشاں (مضطرب) ہو گئے، باالفاظ دیگر اس کی تابش جمال کے سامنے آئینہ بھی ماند پڑ گیا۔

سلیم چشتی

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

(1) جس طرح گردشِ آفتاب سے سال کا حساب کیا جاتا ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ عمرِ رواں کا حساب برق کی رفتار سے کرنا چاہئے۔ گویا عمر انسانی مقدار چشمکِ برق کے برابر ہے یعنی وہ بہت جلد فنا ہوجانے والی ہے۔

نظامی بدایونی

(2) جب سے انسان نے حیات و کائنات پر غور کرنا شروع کیا کہ ہستی کی اصل کیا ہے۔ اس زمانے سے آج تک سب سے زیادہ اہم مشکل اور ناقابل حل مسئلہ یہ رہا ہے کہ وقت یا زمان کیا ہے۔ اگرچہ اس سے مکان کا مسئلہ بھی وابستہ رہا لیکن زمان کی ماہیت کا جاننا اس سے زیادہ اہم سمجھا گیا۔ زمان کیا ہے۔ کیا اس کی کوئی ابتدا یا انتہا ہوسکتی ہے۔ تمام واقعات کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کرتا ہے۔ مگر خود کوئی وجود یا واقعہ نہیں بنتا۔ یہ جو کچھ بھی ہو ہمیں اس کا احساس کس طرح ہوتا ہے۔ کیا اس کا وجود مستقل خارجی حقائق میں سے ہے یا یہ ہمارے نفس کا ایک اندازِ فہم ہے۔

اگر مادی دنیا اور اس کے اندر اشیا کی حرکت نہ ہو تو کیا پھر بھی وقت پایا جائے۔ اگر ہمارا شعور واقعات کو یکے بعد دیگرے نہ جانے تو کیا اس حالت میں وقت کا وجود ہوگا۔ وقت کو نفسی طور پر ہم کبھی طویل محسوس کرتے ہیں اور کبھی مختصر۔ کیا اسے ناپنے کا کوئی مستقل غیر متغیر پیمانہ بھی ہے۔ خوشی کا وقت بہت جلد گذرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور مصیبت یا بیزاری کا وقت نہایت سست رفتار ہوجاتا ہے۔ عاشق کو شبِ فراق کی طوالت دوسری راتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے اور وصل کا زمانہ آناً فاناً گذر جاتا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم

(3) دنیا میں عمر بسر کرنا گویا انتہائی اضطراب اور بے چینی کے دن کاٹنا ہیں۔ اس لئے عمر کا حساب آفتاب کی گردش سے نہیں بلکہ تابشِ برق سے کرنا چاہئے۔

نیاز فتح پوری

(4) انسان بحالت اطمینان وسکون آہستہ روی سے راستہ طئے کرتا ہے اور بحالتِ اضطراب و پریشانی انتہائی سرعت سے گذر جاتا ہے۔ عمر کے گذرنے کو رہِ اضطراب کے قطع کرنے سے تشبیہہ کے دو وجوہ ہیں۔ ایک تو سرعت دوسرے پریشانی۔ انسان کی عمر سرعت سے کٹتی ہے اور جب تک زندہ رہتا ہے ہر حال میں مضطرب و پریشان رہتا ہے۔ نہایت بدیع اور انوکھی تشبیہہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے مصرعہ میں سرعت رفتار کی توضیح کی گئی ہے۔ رفتار کا اندازہ وقت سے کیا جاتا ہے مثلاً فی ثانیہ اتنے میل کی رفتار یا فلاں فاصلہ اس مدت میں طئے ہوگا اور وقت آفتاب کی گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ آفتاب جب بارہ برج طئے کرے اور پورے بارہ مہینے گذریں تب کہیں چل کر ایک سال ہو۔ عمر کی تیز رفتاری کے لئے وقت کا یہ پیمانہ موزوں نہیں۔ آفتاب کی گردش کی بجائے بجلی کی چمک کا پیمانہ مناسب ہے۔ یعنی بجلی جتنی دیر میں چمکے ایک سال۔ بس اسی حساب سے عمر گذر رہی ہے۔

شہاب الدین مصطفیٰ

(5) جس طرح سال کا حساب گردشِ آفتاب سے طئے کرتے ہیں اسی طرح عمرِ گریزاں کے سال کا حساب رفتارِ آفتاب کے بدلے رفتارِ برق سے کرنا چاہئے۔

آغا محمد باقر

(6) عمر جو گذر رہی ہے وہ بحالت اضطراب راہ طئے کر رہی ہے۔ اس سال کا حساب بجائے گردشِ آفتاب برق سے لگانا چاہئے یعنی عمر بہت تیز رفتار سے کٹ رہی ہے۔

شاداں بلگرامی

(7) انسان کی تمام عمر ایک اضطرابی کیفیت میں بسر ہو جاتی ہے۔ اس کی سرعتِ رفتار کا اندازہ مقصود ہو تو یوں سمجھو کہ عمر کا ایک سال گویا ایک چشمک برق کے برابر ہے۔ یعنی انسان کی عمر اگر سو سال کی ہو جائے تو بھی مرتے وقت اس کو یہی محسوس ہوگا کہ سو لمحات یا چند ساعتوں سے زیادہ وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔

سلیم چشتی

(8) عمر کی رفتار اضطراب کے راستے میں کٹی ہے۔ اس سال کا حساب لگانا ہو تو آفتاب کی بجائے برق سے حساب لگانا چاہئے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

عمر میری ہوگئی صرفِ بہارِ حسنِ یار
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ وسالِ عندلیب

(1) ایک ہم ہیں کہ ہماری عمر اس میں صرف ہوگئی کہ بہار حسن دیکھ رہے ہیں اور ایک عندلیب کہ اس کے ماہ وسال پلٹتے رہتے ہیں۔ کبھی خزاں ہوتی ہے اور کبھی بہار ہوتی ہے اور برابر رنگ چمن گردش کرتا رہتا ہے۔

عبدالباری آسی

(2) سائنس کا جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ وقت محض ایک اضافی قیاس ہے درحقیقت اس کا کوئی وجود نہیں۔ غالباً اس شعر میں یہی بات شاعر کہتا ہے۔

میری عمر بہار حسن میں گذر گئی۔ مجھے سوائے نظارہ حسن کے وقت گذرنے کا احساس ہی نہیں میری مثال اس بلبل سے دی جاسکتی ہے جو گردش رنگ وچمن ہی کو اپنے ماہ وسال سمجھتا ہے۔

وجاہت علی سندیلوی

(3) عندلیب کا وقت اور عمر کیا ہے۔ باغ کے رنگ کو اور اس کی گردش کو دیکھتے رہنا۔ بہار آئے کہ خزآں بلبل کی توجہ کا واحد مرکز رنگِ چمن ہے۔ میری عمر بھی حسنِ یار کی بہار کی طرف مرکوز رہنے میں صرف ہوگئی۔ مجھے اور کسی کام سے کام ہی نہیں۔

گیان چند جین

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہوجانا

(1) مسئلہ استحالہ عناصر جس کو حکمائے جدید مانتے ہیں غالب سے بھی پوشیدہ نہ تھا۔ اس شعر میں اسی مسئلہ کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے۔

نظامی بدایوانی

(2) غالب نے اس شعر میں سائنس کے ایک مسلمہ اصول سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اسلوب احمد انصاری

(3) غالب نے اس شعر میں استحالہ عناصر کو شاعرانہ رنگ میں ثابت کیا ہے۔ (استحالہ عناصر سے مراد ہے ایک عنصر مثلاً پانی کا دوسرے عنصر مثلاً ہوا میں تبدیل ہوجانا) کہتے ہیں کہ جب تک ہم میں طاقت تھی، رات دن روتے رہتے تھے، مگر جب ضعف لاحق ہوا تو آنسو بہانے کے بجائے ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے۔ یہ دیکھ کر ہمیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ واقعی پانی (گریہ) ہوا (دم سرد) میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

سلیم چشتی

(4) ہم مسئلہ استحالہ عناصر کے قائل نہ تھے یعنی یہ کہ پانی بھی مبدل بہ ہوا ہوجاتا ہے اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک عنصر دوسرے عنصر میں کس طرح تبدیل ہوسکتا ہے لیکن اب جب کہ انتہائی ضعف سے ہم نالہ نہیں کرسکتے صرف آہیں کررہے ہیں تو ہمیں اس امر کا یقین ہوگیا کہ پانی ہوا بن سکتا ہے۔

محمد عنایت اللہ

(5) اب تک ہم مسئلہ استحالہ عناصر کے قائل نہ تھے گویا نہ مانتے تھے کہ پانی بھی ہوا بن جاتا ہے یعنی ایک عنصر دوسرے عنصر میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ مگر اب یہ مسئلہ ہماری سمجھ میں آگیا۔ کیوں کہ ہم نے

اس کو عملی طور پر دیکھ لیا۔ وہ اس طرح سے کہ جب ہم میں طاقت تھی تو ہم گریہ کیا کرتے تھے لیکن اب ضعف اس قدر بڑھ گیا ہے کہ گریہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے بدلے اب ہم سرد آہیں بھرتے ہیں یعنی پانی (گریہ) نے ہوا (آہ) کی صورت اختیار کر لی ہے۔

آغا محمد باقر

(6) اس میں سائنس کے اہم ترین مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ضعف کی وجہ سے اندرونی حرارت اور جوش کم ہو جاتا ہے۔ تبخیر کی کمی کے باعث یا ٹھنڈ پہنچنے سے ہمارے آنسو دوبارہ سرد ہو جاتے ہیں۔ اور اس تکثیف کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ مسئلہ تبخیر بالکل درست ہے۔ کیوں کہ اگر جوش دینے سے پانی بھاپ میں منتقل نہ ہوتا تو سردی پہنچنے سے ہرگز دوبارہ پانی میں منتقل نہ ہو سکتا۔ گویا مسئلہ تکثیف Condensation نے مسئلہ تبخیر Evaporation کو ثابت کر دیا۔

احمد الدین مارہروی

سب کہاں ، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی ، کہ پنہاں ہو گئیں

(1) غالب نے مادّے کی غیر فنا پذیری کے مسئلے کو غزل کی زبان میں یوں بیان کیا ہے۔

اسلوب احمد انصاری

(2) کیسی کیسی حسین صورتیں خاک میں پنہاں ہو گئیں۔ ان میں سب تو نہیں ہاں کچھ حسین صورتیں بشکل لالہ و گل نمایاں ہو گئیں۔ شاعر نے حسن تعلیل سے کام لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ لالہ و گل میں جو اس قدر حسن و دلکشی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حسینانِ عالم، جن کو بعد وفات زیر زمین دفن کیا گیا، ان پھولوں کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

سلیم چشتی

(3) جو بے شمار حسین خاک میں پوشیدہ ہیں ان میں سے کچھ لالہ و گل کا روپ بدل کر نمایاں ہو گئیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کیسے کیسے خوبصورت زیر زمین ہیں۔

شہاب الدین مصطفیٰ

(4) خیال یہ ہے کہ پھول حسینوں کی خاک سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ نیز جیسا حسین ہوتا ہے ویسے ہی خوبصورت پھول اس کی خاک سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے لالہ و گل کو دیکھ کر افسوس کے لہجہ میں کہتے ہیں کہ خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے حسین خاک میں مل کر خاک ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک حسینوں کی صورتیں تو لالہ و گل کی صورت میں ظاہر ہو گئی ہیں۔ باقی کا کہیں پتہ نہیں۔

آغا محمد باقر

(5) مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ جو چمن میں بعض نہایت خوشنما پھول کھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ہے ان کی اصل کیا ہے؟ آہ یہ سب ظالم موت کی خونچکانیاں اور گل کاریاں ہیں کہ جس نے کتنے گلبدن، گل اندام، گلفام اور گلرو حسینوں کو خاک میں ملا دیا کہ جو لالہ و گل کی صورت میں کچھ

کچھ نمایاں ہو رہے ہیں۔ آہ وہ کتنی دلفریب، روح پرور اور کیسی پیاری پیاری صورتیں ہوں گی کہ جو خاک میں مل گئیں۔

محمد عنایت اللہ

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیئے

(1) اگر میرے امکان اور قدرت میں ہوتا تو میں خاک سے پوچھتا تو نے وہ گراں بہار خزانے کملاو مہرہ کے کیا کیے۔

شاداں بلگرامی

(2) اگر زمین میں سننے اور جواب دینے کی صلاحیت ہوتی تو میں اس سے دریافت کرتا کہ تو نے ان نامور افراد کو، جو تیرے اندر دفن کیے گئے کہاں غائب کر دیا؟ وہ سب کہاں چلے گئے؟

سلیم چشتی

(3) ہزاروں اہل ہنر جو حقیقت میں علم و حکمت کے قیمتی خزانے تھے زمین میں دفن ہیں۔ یہ کمبخت لئیم ان خزانوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ نہ خود ان سے فائدہ اٹھائے نہ دوسروں کو فائدہ اٹھانے دے اگر مجھ کو یہ قدرت حاصل ہو جائے کہ ان خزانوں کا حساب اس لئیم سے لوں تو پھر اس سے پوچھوں گا کہ یہ سب گنج ہائے گراں مایہ تو نے کیا کئے اور کہاں چھپائے رکھے ہیں۔

شہاب الدین مصطفیٰ

(4) اگر یہ دولت میرے پاس جمع ہو جائے تو میں لوگوں کو فائدہ پہنچاؤں اور زمین کو طعنہ دوں کہ آخر تو نے اس قدر خزانوں سے کیا کام لیا یا کسی کو فائدہ پہنچایا۔

عبدالقادر آسی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

(1) باد پیمائی کے دو معنی ہیں۔ باد پیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ لہٰذا بادہ نوشی محض باد پیمائی یعنی ایک فضول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی، مبتدا اور باد پیمائی خبر ہوگی۔
دوسرے معنی یہ ہیں کہ باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے اور باد پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔ اس صورت میں مطلب یہ نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔

حالؔی

(2) بہار کی وجہ سے ہوا میں شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے تو شراب پینا فضول ہے۔ ہوا کھانے ہی سے شراب کا لطف ملتا ہے۔ یہ معنی اختیار کرنے میں ''باد پیمائی'' کے معنی ہوا کھانے کے ہوئے۔ باد پیمائی کے معنی عبث کام کرنے کے لئے جائیں تو شعر کے یہ معنی ہوں گے کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے اس لئے بادہ نوشی محض فضول کام ہے۔

نظامی بدایونی

(3) (اے ساکنان خطہ خاک) مستی و سرور کے لئے اب شراب پینا ایک فعل عبث ہے اس لئے کہ ہوا میں خود شراب کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ بغیر شراب نوشی کے ہی ہر شخص خوشی سے بدمست مخمور و مسرور ہو رہا ہے۔

شہاب الدین مصطفیٰ

غم اِس کو حسرتِ پروانہ کا ہے، اے شعلہ!
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

(1) شعلہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے شعلہ تیرے لرزنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرتِ پرواز کے غم سے شمع ناتواں ہوگئی ہے۔

نظامی بدایونی

(2) اے شعلہ تیرے لرزنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمع حسرت پروانہ کے غم میں ناتواں ہوگئی ہے گویا شمع کی لو کا لرزنا شمع کی ناتوانی کی نشانی ہے اور یہ لرزنا اس وجہ سے ہے کہ وہ حسرت و ناکامئ پروانہ کے غم میں گھلے جاتی ہے۔

آغا محمد باقر

(3) شمع کی لو عموماً تھرتھراتی ہے۔ اس لرزش کی وجہ غالبؔ نے یہ بیان کی ہے کہ شمع، پروانے کے غم میں اس قدر ناتواں ہوگئی ہے کہ اس کا اثر شعلۂ شمع پر بھی مرتب ہوگیا یعنی لرزش شعلہ کا سبب، ناتوانی شمع ہے۔

سلیم چشتی

(4) اے شعلہ تیرے کانپنے سے شمع کی ناتوانی ظاہر ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسرتِ پروانہ کا غم کرتی ہے اور تیرا لرزنا محض تیری ناتوانی کی وجہ سے ہے۔

عنایت اللہ

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

(1) پہلے مصرعہ میں جو چار چیزیں بیان کی گئی ہیں مصرعہ ثانی میں ان کی صفات اسی ترتیب سے درج ہیں یعنی آگ کی صفت سوز، پانی نم، ہوا کی صفت رمیدگی اور خاک کی صفت سکون۔ روز ازل ان چار چیزوں کو یہ صفات دی گئیں۔

شہاب الدین مصطفیٰ

(2) آگ نے سوزش کی اور ہوا نے رم (گریز حرکت) کی اور پانی نے تری کی اور خاک نے سکون کی صورت اختیار کی۔ دو الفاظ کو میں نے مقدم اور موخر کر کے ترتیب عناصر کو مطابق محل کر دیا۔

شاداں بلگرامی

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گذر نہ کر
ہر ذرّے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

اے محبوب! بغیر منہ چھپائے وادی مجنوں میں نہ جاؤ۔ کیوں کہ اس وادی کا ہر ذرّہ ایک دل بے قرار ہے جس کے دیکھنے کو ستمگر ہوتے ہوئے بھی متحمل نہ ہوں گے۔ یعنی ذرّہ کی آڑ میں مجنوں کا دل بے قرار ہے۔ ذرّہ کے جگمگانے کو دل کے تلملانے کے ساتھ تشبیہہ تام ہے۔

شاداں بلگرامی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

(1) سبزہ کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ جب اس کو زمین پر جگہ نہیں ملی تو پانی کی سطح پر کائی بن کر تیرنے لگا۔

شہاب الدین مصطفیٰ

(2) جب سبزہ کو روئے زمین پر کہیں جگہ نہ مل سکی تو وہ کائی بن کر سطح آب پر نمودار ہو گیا۔ یعنی جسے تم کائی کہتے ہو یہ دراصل سبزہ ہے جس نے اپنی شکل وصورت تبدیل کر لی ہے۔

سلیم چشتی

(3) کثرتِ سبزہ وگل سے سبزہ کو جب روئے زمین پر جگہ نہ ملی تو وہ آخر کار سطح آب پر کائی بن کر ظاہر ہو گیا۔ کائی بھی سبز ہوتی ہے۔

آغا محمد باقر

بس کہ زیرِ خاک، با آبِ طراوت راہ ہے
ریشے سے ہر تخم کا، دلو اندرونِ چاہ ہے

تخم کو زیرِ خاک بویا جائے تو اس کی آبِ زیرِ زمین سے رسم و راہ ہوتی ہے۔ تخم سے ریشہ پھوٹ کر نیچے کو جاتا ہے اور کنویں میں ڈول کی طرح پانی مہیا کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو کوئی خاک میں ملتا ہے وہ کامراں ہوتا ہے۔

گیان چند جین

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد!
مئے ہے یہ، مگس کی قئے نہیں ہے

(1) زاہد جو شہد کے پینے کو ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اس کو شراب کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قئے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

حالؔی

(2) مگس کی قئے سے مراد شہد ہے۔ زاہد سے خطاب ہے کہ تو جو شراب پینے سے انکار کرتا ہے اور شہد کے پینے کو ثواب سمجھتا ہے یہ کیوں؟ قابل نفرت تو شہد ہے جو شہد کی مکھی کی قئے ہے نہ کہ شراب۔

نظامی بدایونی

(3) اے زاہد! تو شراب پینے سے کیوں انکار کرتا ہے۔ یہ شراب ہے یعنی بہت قیمتی شئے ہے مگس کی قئے (شہد) نہیں ہے۔ شہد کو مگس (مکھی) کی قئے سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ زاہد اس سے متنفر ہو جائے۔

سلیم چشتی

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

(1) غذا ہضم ہونے اور خون بننے سے پہلے طبخ اول میں کیلوس کی شکل اختیار کر کے آش کے مانند اور اس کے بعد طبخ دوم میں کیموس کی صورت پا کر پانی کے مانند ہو جاتی ہے اور خون کی شکل اختیار کرتی ہے۔ غالبؔ بیماری غم عشق کی فراغت کا ذکر کرتا ہے کہ خون کے کھانے میں کیلوس، کیموس وغیرہ کے جھگڑے پیش نہیں آئے اور ابتداء ہی سے خونِ جگر کھایا کئے۔

حسرت موہانی

(2) کیموس طبّی اصطلاح میں ہضم جگر کو کہتے ہیں جس سے غذا ہضم ہو کر خون بن جاتی ہے مگر اس سے پہلے غذا کیلوس کی شکل اختیار کرتی ہے اور بعد میں کیموس، لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بیماریٔ غم کی فراغت کا کیا بیان کروں اس میں کیلوس و کیموس کا دخل نہیں۔ ابتداء ہی سے خون جگر کھاتا ہوں۔

محمد عنایت اللہ

(3) بیماریٔ غم کی فراغت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ میں کھاتا ہوں وہ کیموس کی منزل سے گذرے بغیر خون بن جاتا ہے اور گویا صحیح معنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں کھانا نہیں کھاتا بلکہ خون کھاتا ہوں۔

نیاز فتح پوری

(4) اگر کوئی شخص غذا کھائے تو قانون فعل ہضم کے مطابق پہلے وہ غذا ''کیلوس'' پھر ''کیموس'' کی شکل اختیار کر کے خون میں تبدیل ہوگی۔ لیکن اگر ایک شخص غذا کی بجائے خونِ دل ہی کو اپنی غذا بنالے تو پھر اسے کیموس کا احسان اٹھانے کی کیا ضرورت۔

سلیم چشتی

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

(1) جس دروازہ سے وہ جھانکتا ہے اس میں روزن نہ سمجھو بلکہ تیغ نگاہ نے زخم ڈال دیا ہے اور زخم بھی ایسا گہرا جس میں سے ہوا نکلتی ہے۔ پھر سینہ عاشق کی کیا حقیقت ہے جس زخم سے ہوا نکلے اور سانس دینے لگے وہ ضرور مہلک ہوتا ہے۔

نظم طباطبائی

(2) اے ظالم سفاک! آبِ تیغ نگاہ کا سینہ عاشق سے کیفیت پوچھتا ہے کہ اس نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ روزن زخم کو دیکھ جس سے ہوا نکلتی ہے یعنی اس نے سینہ میں زخم ڈال دیا ہے اور زخم ایسا گہرا ہے جس سے ہوا نکلتی ہے اور جو زخم ہو وہ ضرور مہلک ہے۔

عبدالقادر آسی

(3) بھلا اطبا کے علاوہ کون اس بات سے واقف ہے کہ زخم کے خراب ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے اندر ہوا نفوذ کر جاتی ہے۔ جو زخم ''سانس دینے لگتا ہے'' ضرور مہلک ثابت ہوتا ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری

(4) جب سینہ کا زخم ہوا دینے لگتا ہے تو اسے مہلک سمجھا جاتا ہے (زخم سینہ کو اس وقت ہوا دینے والا کہتے ہیں) جب پھیپھڑے کی ہوا جو ناک اور منہ سے نکلتی ہے سینہ کے زخم سے نکلنے لگے۔

نیاز فتح پوری

(5) معشوق کی تیغ نگاہ کی آبداری اور تیزی کی کیفیت سینۂ عاشق سے نہ پوچھو کہ وہ کیسی ہے بلکہ روزنِ در کے زخم کو دیکھو وہ اتنے بڑے ہیں کہ ان میں سے ہوا نکلتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ نظر جس نے دروازے کے کواڑوں میں اتنے بڑے بڑے سوراخ ڈال دیئے کہ ان میں سے ہوا نکلتی ہے۔ اگر سینۂ عاشق پر وار کرے گی تو ظاہر ہے کہ اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ جس زخم سے ہوا نکلے وہ مہلک ہوتا

ہے، اس لئے سینۂ عاشق کے زخم جوان کی نگاہ نے ڈالے ہیں سخت مہلک ہیں اور زخمِ روزنِ در سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معشوق دروازہ میں سے جھانکتا ہے اور اس کے دروازے میں جو سوراخ ہیں، وہ اس کی تیغ نگاہ کے زخم ہیں۔

آغا محمد باقر

(6) اے ہمدم! محبوب کی تیز نگاہ کے زور (دھار۔توڑ۔کاٹ) کو کچھ نہ پوچھ۔ وہ تیز نگاہ تو سینۂ دل عاشق سے پار نکل گئی ہے اور اب اس میں سے خوب فراٹے کے ساتھ ہوا آجاتی ہے۔

شاداں بلگرامی

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہِ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

(1) سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔ اسی سے فائدہ اٹھا کر مصنف نے سرمہ اور خاموشی کو ایک چیز بتلایا ہے۔ کہتے ہیں خاموشی کی وجہ سے تیری نگاہ جو انداز تماشا دکھانے والی ہے، تیرے دل سے سرمہ آلود ہو کر نکلتی ہے۔

حسرت موہانی اور سعید الدین

(2) خاموشی میں تیری نگاہ تیرے دل ہی سے سرمہ آلود ہو کر نکلتی ہے یعنی تیری خاموشی ہی نگاہ کو سرمہ آلود کر دیتی ہے یعنی بہ سبب ملائمت کے خاموشی اور سرمہ ایک ہی چیز ہے۔

نظم طباطبائی

(3) نگاہ تماشا ادائے معشوق میں اور کوئی سرمہ نہیں لگاتی بلکہ وہ اس کے دل ہی سے سرمہ سا ہو کر نکلتی ہے اور خموشی ہی اس کو زینت دیتی ہے۔ یعنی اس میں سرمہ لگاتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جب تو خاموشی کی حالت میں تماشائے بزم کرتا ہے تو تیری نگاہ پیاری اور سرمہ سا معلوم ہوتی ہے۔

عبدالقادر آسی

(4) سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔فرماتے ہیں، تیری خاموشیوں میں بھی ایک ادائے اظہار پائی جاتی ہے۔ گویا تیرے دل کے ارادے سے جو نگاہ نکلتی ہے، وہ سرمہ سا نکلتی ہے۔یعنی آواز بے صوت ہوتی ہے۔

بےخودموہانی

(5) یونانی حکما اوران کے اتباع میں اکثر قدیم حکما کا خیال تھا کہ روشنی کی لکیر آنکھ سے نکل کر اشیاء پر پڑتی ہے تو اشیاءنظر آتی ہیں۔یعنی آنکھ منبع اور مخرج ہے روشنی کا۔اوراگر روشنی آنکھ سے نکل کر خارج کی شئے پر پڑتی ہے تو تارنگاہ وغیرہ قسم کے استعاروں کا جواز بن جاتا ہےاورآگے چلئے۔مسلمان صوفیا کی اصطلاح میں ''قلب'' کے معنی محض ''دل''نہیں ہے،لیکن عام زبان میں ''دل''اور''قلب'' تقریباً مرادف ہیں۔اس لئے صوفیانہ اصطلاح کے بموجب قلب کی جوصفات ہیں ان میں سے اکثر دل پر بھی منطبق کردی گئیں۔چنانچہ ''دل کی آنکھیں کھل جانا''،''دیدۂ دل''، ''چشم دل''،''دیدۂ باطنی'' وغیرہ محاورےاوراستعارے وجود میں آئے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

(6) ہماری جو خاموشیاں ہیں ان میں جو ادا نکلتی ہے وہ قابل تماشا ہے کیوں کہ یار کی نگاہِ سرگیں ہمارے دل میں اتر گئی ہےاورہم اسی لئے خاموش رہتے ہیں۔سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے اس میں یہی رعایت مضمر ہے۔

عنایت اللہ

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

(1) فلسفہ جدید کا مسئلہ دوران خون جواب ثابت ہوا ہے اس شعر میں نظم کیا گیا ہے اس سے غالبؔ کے فلسفیانہ مذاق کا ثبوت ملتا ہے۔ شرر سے مراد روح حیوانی ہے جو انسان میں موجود ہے وہ کہتا ہے کہ روح کی حرارت سے انسان کو سانس لینے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ ہر سانس میں ہوا سے روح کو مشتعل کرنا مطلوب ہے۔

نظامی بدایونی

(2) دوران خون کا مسئلہ جب سے ثابت ہوا ہے اسی سے ظاہر ہے کہ ہر سانس میں ہوا سے روح حیوانی مطلوب ہے اور جو ہوا نکلتی ہے وہ بعینہ ویسی ہی ہے جیسے کہ ہوا چراغ کی لو سے پیدا ہوتی ہے۔

نظم طباطبائی

(3) لوگ ہم کو طعنہ دیتے ہیں کہ دل کی آتشِ غم سے گھبرا کر ہم کو ہوا کھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے ہم گھبرا کر گرمی کے مٹانے کے لئے ہوا نہیں کھاتے بلکہ آگ کے بھڑکانے کے لئے ہوا کھاتے ہیں یعنی سانس لیتے ہیں۔

عبدالقادر آسیؔ

(4) آتش عشق ایک چنگاری ہے اس سے ہم گھبرانے کیوں لگے۔ ہوا کا جو ہم نام لیتے ہیں اس سے ہمیں اس کا اور بھڑکانا مقصود ہوتا ہے۔ نہ تفریح و تسکین۔

شاداں بلگرامی

(5) ہوا بمعنی سانس اور شرر سے مراد روح حیوانی ہے جو بمنزلہ ایک شرارے کے ہے اس کی سوزش و حرارت سے ہم کیوں گھبرائیں گے بلکہ ہم تو اسی آگ کو بھڑکانے اور سلگانے کے لئے ہوا کھاتے ہیں یعنی ہمارا سانس لینا محض اشتعال حرارت کے خیال سے ہے اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں

کہ ہمارے دل میں آتش عشق کا صرف ایک شرارہ ہے اس سے ہم کیا خوف کھائیں گے اس لئے تو اسے ہوا یعنی ہیچ کہتے ہیں کیوں کہ یہ ہمارے حوصلے اور ظرف کے مقابلے میں بہت کم ہے ہمیں تو آگ مطلوب ہے۔

محمد عنایت اللہ

(6) ہم دل کی آگ سے نہیں گھبراتے بلکہ اسے اور بھڑکانا چاہتے ہیں۔ پس اگر ہم ہوا طلب کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد گرمی پانا نہیں بلکہ آگ کو بھڑکانا ہے۔

سلیم چشتی

(7) ہمارے دل میں آتش عشق کا ایک شرارہ ہے۔ بھلا ہم اس شرارہ سے کیا گھبرائیں گے۔ حقیقتاً ہمیں شرارہ کی ضرورت نہیں بلکہ ہمیں آگ مطلوب ہے اور اسی لئے ہم بے چین ہیں۔

آغا محمد باقر

(8) ہمارے دل میں عشق کی ایک چنگاری ہے۔ اس سے ہماری تشفی نہیں ہو سکتی۔ ہم کو زیادہ آگ چاہئے اس لئے ہم اس چنگاری کو ہوا دے کر بھڑکانا اور آگ کے شعلے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کم فہم اور کم ہمت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہوا کے ذریعہ اس ایک چنگاری کی حرارت بھی دور کرنا چاہتے ہیں۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ آہ اس لئے بھرتے ہیں کہ آتش عشق تیز ہو۔

شہاب الدین مصطفیٰ

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں!
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

(1) اس شعر میں مرزا نے مسئلہ دوران خون کی شرح لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر نفس سینہ میں اشتعال پیدا کرتا ہے اور وہی اشتعال انسانی زندگی کے قیام کا باعث ہے گویا فطرتاً ہر انسان ذوقِ فنا رکھتا ہے لیکن شاعر اپنے ذوق فنا کو ناقص بتا کر کہتا ہے کہ اس پر ہمارا جی جلتا ہے کہ ہم باوجود اپنے نفس کی آتشبازی کے یکبارگی جل کر فنا نہیں ہوتے۔

نظامی بدایونی

(2) ہم چاہتے تو یہ ہیں کہ کسی طرح یک دم جل کے فنا ہو جائیں لیکن باوجود اس کے کہ ہمارا نفس آتش بار ہے ہم جل نہیں سکتے اور اس طرح ذوقِ فنا کے پورے نہ ہو سکنے پر ہمارا جی ہر وقت جلتا رہتا ہے۔

نیاز فتح پوری

(3) ہمارا ذوقِ فنا ناتمام یعنی ناقص ہے کیوں کہ باوجود نفس کی آتش بازی کے ہم ایک بار جل کر فنا کیوں نہیں ہو جاتے۔

حسرت موہانی

(4) تحقیقات جدید سے معلوم ہوا ہے کہ سانس کے ذریعہ جو ہوائے ترش انگیز (آکسیجن) سینہ اور پھیپھڑوں میں جاتی ہے اشتعال پیدا کرتی ہے اور وہی اشتعال باعث حیات ہے۔ حالاں کہ ہر اشتعال میں جسم کا انس اور بدن کا ہیر فنا ہے۔ اس لئے وہی اشتعال جو فنا کرتا ہے وہی موجب حیات بھی ہے لیکن اس ذوقِ فنا کی ناتمامی پر جی جلتا ہے کہ ایک بار جلا کیوں نہیں دیتا۔

نظم طباطبائی

(5) آدمی کے سینے میں جو شعلہ روح روشن ہے اس کو ہر سانس جو اندر جاتی ہے مشتعل کرتی ہے اور

اسی اشتعال کی بنا پر انسان زندہ ہے علاوہ ازیں (اس سانس سے) کچھ نہ کچھ بدن کا حصہ فنا ہو جاتا ہے لہٰذا انسان (بلکہ ہر ذی روح) طبعاً و فطرتاً ذوقِ فنا رکھتا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ مجھ کو اپنے ذوق فنا کی ناتمامی پر افسوس ہوتا ہے کہ باوجود یہ کہ نفس آتش بار ہے لیکن پھر بھی ہم جل کر فنا نہیں ہو جاتے

محمد عنایت اللہ

(6) ہر چند میری سانس سے شعلے آگ کے نکلتے ہیں۔ مگر ایک دَم مجھ کو جلا کر فنا نہیں کر دیتے۔ لہٰذا ذوقِ فنا کے ناتمام رہنے پر میرا جی جلتا ہے۔

شاداں بلگرامی

(7) انسان کے دل میں ایک شعلہ روشن ہے، سانس کی آمد و رفت اس کو ہر دم مشتعل کرتی رہتی ہے۔ اس آگ کی گرمی سے تخریب و تعمیر کے عمل کے ساتھ ساتھ انسان کی زندگی قائم رہتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر انسان کو فنا کا ذوق ہے لیکن ہمارا دل اس ذوقِ فنا کی ناتمامی پر جلتا ہے کہ ہم اس نفسِ شعلہ بار سے ایک دم ہی کیوں نہ جل گئے۔

آغا محمد باقر

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

(1) اے ناتمامی آہ شعلہ بار ہزار افسوس ہے تو ہم کو بتدریج جلا رہی ہے لیکن ہم اس بات کے تصور سے جل رہے ہیں کہ ہم ایک دم کیوں نہ جل گئے۔ مفہوم یہ ہے کہ جو آگ ہمارے سینہ میں جل رہی ہے اس کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ہم ایک بار جل کر خاکستر ہو جائیں لیکن ہماری نامرادی و ناتمامی ایک بار جل جانے سے رکتی ہے۔

محمد عنایت اللہ

(2) اس شعر میں ایک طب کا مسئلہ ہے جو مرزا صاحب نے پہلے بھی بیان کیا ہے۔ یعنی ہر سانس کے ساتھ جو ہوا جسم میں داخل ہوتی ہے وہ ترویج قلب بھی کرتی ہے اور حرارتِ عزیزی کو برانگیختہ بھی اور یہی حرارت فنا و بقا کا باعث ہے۔

آغا محمد باقر

(3) میں بہت ملول اور رنجیدہ ہوں کہ اگرچہ میری سانس شعلے برسا رہی ہے مگر کوئی شعلہ ایسا نہیں نکلا جو مجھے ہمیشہ کے لئے جلا کر خاک کر دیتا۔ اے نفسِ شعلہ بار تیری کوتاہی پر کمال افسوس ہے۔

سلیم چشتی

(4) ہم کو اس کا رنج ہے اور افسوس ہے کہ ہمارا عشق ہنوز پختہ و کامل نہیں ہوا اس لئے نفسِ شعلہ بار کی تپش و حرارت بھی ناتمام و ناقص ہے۔ تھوڑا سا جلاتی ہے۔ اگر عشق کامل ہوتا تو نفس کی حرارت بھی کامل ہوتی اور ایک ہی نفس شرربار سے ہم کو پوری طرح جلا دیتی اور اس ہر وقت کی جلن سے نجات ملتی۔

شہاب الدین مصطفیٰ

کچھ نہ کی، اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں
ذرّہ ذرّہ، روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

(1) عشق ناقص نے ہم کو اکتساب فیض سے محروم رکھا، ورنہ دنیا کا ہر ذرّہ اکتساب نور سے رشک آفتاب بنا ہوا تھا۔

نظم طباطبائی اور بے خود موہانی

(2) اگر عشق ناتمام نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ذرّہ آفتاب کے برابر ہو جاتا۔ لیکن نارسائی جنون نے اکتساب فیض سے محروم رکھا اور ایسا نہ ہونے پایا۔

حسرت موہانی

(3) اس شعر میں شاعر نے اپنے عشق کی نارسائی پر اظہار افسوس کیا ہے اور اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ محبوب حقیقی تک پہنچنے کے لئے کوئی رکاوٹ موجود نہیں اگر ہم اس تک نہیں پہنچ سکے تو اس کی وجہ ہمارے عشق کی ناتمامی ہے ورنہ اس جہان کا ہر ذرہ خورشید عالم تاب کا مقابل بن سکتا ہے۔ اگر ہم اکتساب فیض سے محروم ہیں تو اس میں ہمارا اپنا قصور ہے۔

محمد عنایت اللہ

(4) اپنا جنون ناقص و ناتمام تھا اس لئے اس نے کچھ نہ کیا ورنہ صحرائے جنون کا تو ذرہ ذرہ روکش آفتاب ہے اور اگر ہم اپنے جنون میں کامل ہوتے تو ہم بھی باوجود ذرہ حقیر ہونے کے آفتاب کا مقابلہ کرتے۔

نیاز فتح پوری

(5) میرے جنونِ ناتمام کے بنائے کچھ نہ بنی۔ کوی خوبی پیدا نہ کرسکا۔ خود کامل ہو جاتا یا معشوق ہی پر اثر ڈال سکتا۔ ورنہ اس میدانِ عشق میں جس ذرہ کو دیکھو وہ اکتساب نور کر کے مقابل آفتاب بن گیا مگر میں ہر طرح کی خوبی سے محروم ہوں۔

شاداں بلگرامی

(6) میرے جذبِ ناقص نے مجھے اکتسابِ فیض سے محروم رکھا یعنی میں اپنی خامی کی وجہ سے مشاہدہ تجلیات نہ کر سکا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے نور سے مستفیض ہو کر آفتاب کا مدمقابل بنا ہوا ہے۔

سلیم چشتی

بلبل کے کاروبار پہ ہیں، خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

(1) بلبل کے حال پر پھول خندہ زن ہیں۔اس سے ثابت ہوا کہ اطبّا نے جو عشق کو فطورِ دماغ کہا ہے وہ صحیح ہے۔

عنایت اللہ

(2) بلبل کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گل ہنس رہے ہیں۔جس طرح کہ اہل جنوں کی حرکات کو دیکھ کر عوام ہنسا کرتے ہیں۔اس سے ثابت ہوا کہ عشق بھی ایک قسم کا جنون ہے۔

شہاب الدین مصطفٰی

(3) بلبل گلوں کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے اور پھول اس پر ہنس رہے ہیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو عشق کہتے ہیں وہ اصل میں خللِ دماغ ہے کیوں کہ دیوانوں پر ہی لوگوں کو ہنسی آیا کرتی ہے۔

آغا محمد باقر

(4) بلبل تو گلوں کے عشق میں نالہ وفریاد کر رہی ہے مگر گل متاثر ہونے کے بجائے شگفتہ ہو رہے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ بلبل کے دماغ میں خلل ہے جو وہ اس فعل عبث (نالہ وفریاد) کی مرتکب ہو رہی ہے۔پھولوں پر تو اس کے نالہ وفریاد کا اُلٹا اثر مرتب ہو رہا ہے۔اگر وہ صحیح الدماغ ہوتی تو اس فعل سے باز آجاتی۔اس کا طرزِ عمل ثبوت ہے اس بات کا کہ اس کے دماغ میں خلل ہے۔

سلیم چشتی

نہ پوچھ نسخہ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

(1) زخم دل کے لئے جو مرہم تیار کیا جاتا ہے اس کا نسخہ عجیب دلکشا ہے اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے مرہم زخم کو تنگ کر کے مندمل کر دیتے ہیں۔ اگر زخم دل پر بھی ایسا ہی کوئی مرہم لگایا جائے تو دل تنگ ہو جائے گا۔ اس لئے زخم دل کے مرہم میں ریزہ الماس شریک کیا جاتا ہے تا کہ زخم زیادہ سے زیادہ کشادہ ہو اور دل کو فرحت بخشے۔

شہاب الدین مصطفیٰ

(2) ہیرا وہ چیز ہے جو شیشے تک کو کاٹ دیتا ہے پھر بھلا وہ زخم میں اور شگاف کیوں نہ کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے زخم دل کے مرہم کا نسخہ آپ کیا پوچھتے ہیں اس میں جزو اعظم تو الماس ہے۔

محمد عنایت اللہ

(3) واضح ہو کہ ریزۂ الماس زخم کو بڑھا دیتا ہے اور عاشق صادق ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کا زخم دل اچھا ہو جائے۔ اس لئے غالبؔ کہتے ہیں کہ تو مجھ سے جراحت دل کے مرہم کا نسخہ کیا پوچھتا ہے؟ بس یہ سمجھ کہ ریزۂ الماس اس مرہم کا جزو اعظم ہے اسی پر دوسرے اجزاء کو بھی قیاس کر کے یعنی عاشقی سراسر اذیت ہے۔

سلیم چشتی

سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے، ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

(1) جس طرح شیشے پر پارہ چڑھانے سے شیشہ آئینہ بن جاتا ہے اور حیران کہلاتا ہے۔ اسی طرح ہم دل بے قرار کے حیراں کیے ہوئے ہیں۔ یعنی پہلے بے قراری کا سیماب ہمارے دل کے شیشے پر چڑھا ہے، پھر اس میں حیرانی کی صفت پیدا ہوئی ہے۔

سعید الدین، حسرت اور بے خود موہانی

(2) سیماب کا کام یہ ہے کہ وہ آئینہ کی مدد کرتا ہے اور اس کو چمکاتا ہے۔ برعکس اس کے ہمارے دل بے قرار نے ہم کو حیران بنا دیا اور پریشان کر دیا۔ یعنی ہم بیکار ہو گئے اور گویا یہ اس سیماب کی نئی تاثیر ہے۔

عبد القادر آسی

فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ
نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز

(1) صنعت ایجاد کے فریب کا تماشا دیکھ! نگاہ عکس بیچ رہی ہے اور خیال آئینے تیار کر رہا ہے۔ مطلب یہ کہ نگاہ حسین مناظر دیکھ رہی ہے اور ان ہی کی بنیاد پر خیال تصورات کے ہوائی قلعے بنا رہا ہے۔

وجاہت علی سندیلوی

(2) اس شعر میں مایا کا فلسفہ ہے۔ عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔ یہ عالم موجودات نہیں ہماری طبع ایجاد کا فریب ہے۔ تخیل نے آئینہ بنایا ہے اور نگاہ عکس پیدا کر رہی ہے۔ ورنہ در اصل دنیا میں کسی چیز کا وجود نہیں۔

گیان چند جین

ہجومِ فکر سے دل، مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

مشہور شعر ہے۔ نازک خیالی کو شیشہ پگھلانے والی شراب سے اور دل کو نازک شیشہ سے تشبیہہ دی ہے۔ لرزنے کو موج مئے کے لرزنے سے مشابہ کیا ہے۔ اتنے بلند و نازک خیالات کو دیکھ کر دل کانپ رہا ہے کہ ان سب کی تاب کیوں کر لائی جائے گی۔ انھیں کیوں کر ظاہر کیا جائے گا۔

گیان چند جین

سینے کا داغ ہے وہ نالہ ، کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

(1) جو قطرہ دریا تک نہیں پہنچتا وہ جذبِ خاک ہو کر رائیگاں ہو جاتا ہے اور جو نالہ لب تک نہیں پہنچتا اس کے ضبط کرنے سے سینے میں داغ پڑ جاتا ہے۔

حسرت موہانی

(2) جو قطرۂ آب دریا تک نہیں پہنچتا وہ جذبِ خاک ہو کر ضائع ہو جاتا ہے اور مٹی پر ایک داغ پیدا کر دیتا ہے۔اسی طرح جو نالہ لب تک نہیں آتا اس کے ضبط کرنے سے سینہ میں داغ پڑ جاتا ہے۔

محمد عنایت اللہ

(3) ہمارے اثر آفریں خیالات جب شعر کی صورت اختیار کر کے لب تک آ جاتے ہیں تو دنیائے شاعری میں ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں اور جو خیالات دل کے دل ہی میں رہ گئے اور ان کے اظہار کا موقع نہیں آیا، وہ دل کے داغ بن کر رہ گئے۔اسی طرح جو قطرہ دریا میں گر کر اپنے کو فنا کر دیا وہ دریا ہو گیا اور جو دریا میں شامل نہیں ہوا خاک کا رزق ہو گیا اور ایک ہلکا سا نشان مٹی پر چھوڑ گیا۔

شہاب الدین مصطفیٰ

موجِ سراب دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

(1) وہ ریت جو دور سے چمکتی ہے اور پیاسے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا بہہ رہا ہے اسی مناسبت سے موجِ سراب کہا گیا ہے اور جس طرح سراب سے پیاسا دھوکا کھاتا ہے اسی طرح وفا محض سراب ہے۔دنیا میں اس کا وجود نہیں ہے۔شاعر کا مطلب یہ ہے کہ دشتِ وفا کے سراب کا ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ

کے عشاق باوفا کا قاتل ہے۔

نظامی بدایونی

(2) سراب اس مقام کو کہتے ہیں جہاں کسی مسافر کو پانی کا دھوکہ ہو جائے اور اکثر یہ رات میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دشتِ وفا کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ میں کیا بیان کروں صرف اتنا بتا دیتا ہوں کہ دشتِ وفا موج سراب کی طرح دھوکا دینے والا ہے۔ جس طرح موجِ سراب پانی کا دھوکا دے کر مسافر کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اسی طرح دشتِ وفا میں کوئی حقیقت نہیں۔ اس کا ہر ذرّہ جوہر تیغ تیز ہے جہاں قدم رکھا وہیں ہلاک ہوا۔ مفہوم یہ ہے کہ میں آرام و محبت کا ایک پیاسا مسافر تھا اور معشوق کی وفا کی صورت پر جو دراصل وفا نہ تھی بلکہ سراب وفا تھا مجھے وفا کا دھوکا ہوا اور اس کی تسکین باطل اور وعدہ خلافی نے مجھے مار ڈالا۔ اس شعر میں فریب وفا کے لحاظ سے استعارہ نہایت موزوں ہے۔

محمد عنایت اللہ

(3) مجھ سے دشتِ وفا کا حال نہ پوچھو۔ وہ تو موج سراب کی طرح مہک ہے اور پیاسے (وفا پرست) کو دھوکا دے کر ہلاک کر دیتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ دشتِ وفا کا ہر ذرّہ جوہر تیغ آبدار ہے، بھلا دشتِ وفا میں گامزن ہو کر کوئی کہاں تک بچ سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وفا جان لئے بغیر نہیں رہتی۔

آغا محمد باقر

(4) وفا جو ایک صفت قلبی ہے شاعر کو خارجاً دشت کی صورت میں نظر آتی ہے اور دشت بھی بے آب۔ ہر جانب جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے ریگ رواں ہے اور سراب کے ذرّات جو تیغ آبدار کی طرح تمازت آفتاب میں لرزاں ہیں۔ اس مقام لق ودق کی صحرا نوردی کا نام عشق ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری

(5) دشتِ محبت کا حال ہم سے نہ پوچھئے کہ کس قدر جان گداز ہے۔ جس نے اس میدان میں قدم رکھا دھوکہ کھایا۔ پہلے تو دور سے موجِ سراب کو دیکھ کر امیدیں وابستہ کیں لیکن جوں جوں آگے قدم بڑھایا اس دشت کا ذرّہ ذرّہ جانستان ثابت ہوا۔

شہاب الدین مصطفیٰ

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

شبنم کا قطرہ سکونی ہوتا ہے اور ایک جگہ ٹھہرا رہتا ہے جب تک کہ سورج کی حرارت اسے خشک نہ کردے۔ غالبؔ نے یہ مضمون باندھا ہے کہ ان کا وجود شبنم کے قطرے کے مثل ہے جو بیاباں میں ایک کانٹے پر ٹھہر گیا ہو۔ جب سورج نکلتا ہے تو اپنی شعاعوں کی گرمی سے شبنم کے قطروں کو جذب کرلیتا ہے۔ کانٹے پر جو شبنم کا قطرہ ہے اس کو جذب کرنے کے لئے بھی اسے اتنی ہی زحمت اٹھانی پڑتی ہے جتنی کہ پورے شبنمستان کے لئے کرنی پڑتی ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ شبنم کے قطرے کی سی حقیر چیز کے لئے آفتاب عالمتاب کو اتنی زحمت میں مبتلا ہونا اور خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے تو جو اہم اُمور ہیں ان کے سرانجام دینے میں کیا کچھ کاوش و کاہش درکار نہ ہوگی۔ شبنم کا قطرہ جب یہ سب کچھ سوچتا ہے تو اس کا دل لرزنے لگتا ہے۔ اس طرح غالبؔ کا تخیل ایک سکونی شئے کو حرکت کی حالت میں دیکھتا ہے۔

یوسف حسین خاں

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

(1) بیاباں جس چال سے بھاگ رہاہے وہ میری ہی چال ہے کہ جتنا میں چلتا ہوں اتنا ہی راستہ دور ہوتا جاتا ہے۔(منزل کے دور ہو جانے کی علت تساوی رفتار خود اور رفتار بیاباں قرار دیتے ہیں۔)

نظم طباطبائی

(2) بحالت دیوانگی میری رفتار وحشت انگیز کی وجہ سے بیاباں بھی مجھ سے کوسوں بھاگتا ہے۔اس لئے ہر ہر قدم پر منزل مقصود سے مجھے دوری ہی ہوتی جاتی ہے۔

شاداں بلگرامی

(3) انسان کا تخلیقی اضطراب اسے کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔وہ جتنا آگے بڑھتا ہے،منزل کی روشنی اس سے دور ہوتی جاتی ہے۔کہتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس رفتار سے میں اپنی سعی و جہد کے بیاباں کو طئے کر رہا ہوں ،وہ بیاباں میرے آگے آگے ویسی ہی رفتار سے دور ہو جاتا ہے جیسے بھاگا چلا جاتا ہے۔انسان کا ذوقِ جستجو بڑے لطیف انداز میں ظاہر کیا ہے۔

یوسف حسین خاں

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر، اگر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا

(1) شعر کا اہم نکتہ یہ مصرعہ ثانی ایک سائنسی حقیقت کا اظہار ہے۔ اس حقیقت تک غالب کا ذہن منطق واستقراء کے ذریعہ نہیں بلکہ وجدانی اور وہبی طور پر پہنچ گیا تھا۔

جدید علم الارض ایسے بہت سے صحراؤں سے واقف ہے جو پہلے سمندر تھے لیکن بعد میں ریگستان بن گئے۔ خود ہمارا ریگستان تھار پہلے سمندر تھا۔ لہٰذا بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا محض تخئیلی توجیہ نہیں، بلکہ منطقی مشاہدہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب اس سائنسی حقیقت سے واقف نہ تھے، ان کا علم وجدانی تھا۔ اس طرح کے اشعار کی زبردست لاشعوری قوت عرفان ومکاشفہ غالب کو دنیا کے عظیم ترین خلاقانہ ذہنوں کی صف میں کھڑا کردیتی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

(2) لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا گھر کثرت گریہ یعنی رونے سے ویران ہوگیا ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ گھر جو کثرت گریہ سے سمندر بن گیا ہے اگر دریا نہ ہوتا تو ویرانہ ہوتا۔ غرض یہ کہ ویرانی بہرحال باقی رہتی۔

عنایت اللہ

(3) ہمارے گھر کی بربادی مقدر ہوچکی ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ صرف رونے سے ویران ہوا ہے۔ اگر نہ روتے بھی تو ویران ہی رہتا۔ رونے سے بحر بن کر ویران ہوگیا۔ اگر نہ روتے بحر کی بجائے صحرا ہوجاتا۔ بہرحال ویران۔

شہاب الدین مصطفیٰ

باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے
کر دیا ہے پا بہ زنجیرِ رمِ آہو مجھے

(1) میری عمر جو فرصت کی تلاش میں رہتی ہے میرے لئے سست رفتاری کا باعث بن گئی ہے۔اس کے ساتھ چلنا میرے لئے ایسا ہی ہے جیسے مجھے رم آہو کے ساتھ زنجیر سے باندھ دیا جائے۔میری رفتار رم آہو سے کہیں زیادہ ہے لیکن ساتھ باندھ دیئے جانے کی وجہ سے اب مجھے اس کے ساتھ رفتار ملا کر چلنا پڑ رہا ہے۔میں اپنی زندگی کی مسافت بہت تیزی سے طئے کر ڈالنا چاہتا ہوں لیکن میری عمر جو فرصت کی تلاش میں رہتی ہے وہ میری واماندگی یا میرے پیچھے پڑے رہ جانے کا باعث ہے۔میرا اور میری عمر کا ساتھ ایسا ہی ہے جیسے کسی تیز رفتار کو کسی سست رفتار کے ساتھ باندھ دیا جائے۔

وجاہت علی سندیلوی

(2) جیسے کسی بھاگتے ہوئے ہرن کے ساتھ کسی کو زنجیر کر دیا جائے تو وہ بھی تیزی سے بھاگتا جائے گا۔میری عمر بھی اسی طرح تیزی سے اُڑی چلی جارہی ہے۔اسے فرصت یا لمحاتِ سکون کی ضرورت ہے۔اس کی تیزی سے مجھے تھکن ہو رہی ہے۔شاید عمر تیز دوڑ کر قیام کی فرصت تلاش کر رہی ہے۔

گیان چند جین

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

(1) کون محوِ آرائش جمال ہے؟ معشوقِ حقیقی بھی ہوسکتا ہے اور حیات و کائنات بھی۔ کون؟ کے جواب میں ان میں سے کسی کو بھی موضوع مان لیا جائے، مراد ارتقاء کے تسلسل سے ہی ہے۔

وحید اختر

(2) اس میں مسئلہ ارتقاء کی طرف ایک اشارہ ہے سمجھ کر اس سے بالکل نیا لطف اور بصیرت حاصل کی جارہی ہے۔

وجاہت علی سندیلوی

(3) نقاب استعارہ ہے عالم قدس سے اور آئینہ اس میں ما کان و ما یکون ہے اور آرائش جمال سے فارغ نہ ہونا کل یوم ہو فی شان ہے۔

نظم طباطبائی

(4) بہت بلند پایہ شعر کہا ہے اور اندازِ بیان بھی بہت دلکش ہے۔ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ اس کائنات کو پیدا کر کے فارغ ہو کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ وہ ہر لحظہ فعل تخلیق یا اپنی ذات کی جلوہ گری (اپنے حسن کی نمائش) میں مصروف رہتا ہے۔

سلیم چشتی

(5) مسئلہ ارتقاء کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ ڈارون Darwin، سپنسر Spencer، رسل والس Wallace، ہیکل Heekel، وائسمین Weismann، مینڈل Mendel وغیرہ نے تقریباً ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے آزاد طور پر اس کا پتہ لگایا۔ میری رائے یہ ہے کہ ہر عہد کی روح العصر ہوتی ہے جس کو المانی Zeitgeist کہتے ہیں۔ وہ روح القدوس کی طرح حسب ضرورت زمانہ انسان کو تعلیم دیتی ہے مرزا غالب نے بھی مسئلہ ارتقاء کو پہچانا ہے۔

لوٹ زے Lotze کا بیان ہے کہ عالم کی یہ کیفیت ہے جس طرح بیج وقفہ وقفہ سے منازل نمو پذیر ہو کر تناور درخت ہو جاتا ہے۔ یہی حالِ عالم ہے۔ وان ہارٹ مان Von Hertmann اس کا قائل ہے۔ زمانہ جدید کا سب سے بڑا فلسفی برگسان Bergson اس کو جانتا ہے اور کہتا ہے کہ حیات جو تمام عالم میں جاری اور ساری ہے بالذات آمادۂ ارتقاء ہے۔ دنیا برابر تکمیل پا رہی ہے اور منتظر ہے۔ مرزا غالب نے اس بات کو کس نزاکت سے کہا ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری

(6) کائنات حسن و عشق ہی کے مظاہر سے لبریز ہے۔ حسن و عشق کا باہمی رابطہ اس قسم کا ہے کہ ایک دوسرے کا آئینہ اور ایک دوسرے کا جواب ہے۔ حسن عشق آفرین ہے اور عشق حسن آفرین۔ حسن کو اپنے آپ سے بھی عشق ہے۔ اس لئے وہ اپنی افزائش و آرائش میں مصروف رہتا ہے۔ غالب کہتا ہے۔ یہ نہیں کہ دنیا کو خلاقِ حسن آفرینی نے ایک مرتبہ پیدا کر دیا۔ اور جو جمال اس میں رکھنا تھا رکھ دیا۔ وہ کہتا ہے کہ حسن آفرینی کی خلاقی کا فعل مسلسل جاری ہے۔ سارا عالم کل یوم ھو فی شان کی تفسیر ہے۔ حسین لوگ دوسروں کی نظر کے سامنے سنگار نہیں کرتے۔ فطرت کی حسن کاری کا بھی یہی انداز ہے۔ زمین کے پردۂ خاک ہی کو لیجئے جو حسن لامتناہی اس میں مضمر ہے، اور جو گل و لالہ اور حسین شکلوں میں مسلسل عدم سے وجود میں آتا رہتا ہے۔ اس کی گل کاری کا سامان زیرِ نقاب خاک ہی میں تیار ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح جنین حسن صورت کی تکمیل تک رحم کے پردے ہی میں نقش و نگار بناتا رہتا ہے۔ فطرت میں کچھ حسن پھوٹ کر باہر آتا رہتا ہے اور کچھ پس پردہ محوِ آرائش رہتا ہے۔ حسن جب باہر آتا ہے تو نقاب کو بھی حسین بنا دیتا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم

(7) مولانا روم نے تفصیلی طور پر جمادات، نباتات اور حیوانات کی ارتقائی حالت کا اپنی مثنوی میں ذکر کیا ہے کہ کس طرح ارتقائی کیفیت ایک اقلیم میں سے گذر کر دوسری اقلیم میں ہوتی ہوئی انسانیت کی منزل تک پہنچی۔ آدم کی صورت گری لاکھوں سال میں ہوئی۔ اس مدت میں ہر روز پچاس ہزار سال کے برابر تھا۔ مولانا روم نے ارتقاء کا محرک عشق کو ٹھہرایا ہے جو کشاں کشاں حیات کو بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ یہ تخلیقی ذوقِ وجدان ہے جو پر اسرار طریقے سے انسانی شخصیت کو لازوال بنا دیتا ہے۔

مولانا روم کو زندگی کے مخفی امکانات پر ایقان تھا۔ یہ روایات صوفیہ کے توسط سے تمام اسلامی دنیا میں پھیل گئیں۔ غالبؔ کو بھی یہ ذہن ورثہ میں ملا۔ انھوں نے خاص انداز میں اس مضمون کو پیش کیا ہے۔

یوسف حسین خاں

حسن خود آرا کو ہے ربطِ تامل ہنوز
غنچے میں دل تنگ ہے حوصلۂ گل ہنوز

حسن خود آرا تغافل کی مشق کر رہا ہے یعنی ابھی مکمل طور سے آراستہ ہو کر جلوہ نما نہیں ہوا ہے۔ مشاطہ اسے پھولوں کے آئینے دکھا کر اس کا سنگھار مکمل کر رہی ہے۔ کائنات کے ارتقاء کی طرف اشارہ ہے۔ اسی مضمون کا ایک اور شعر ہے

پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز

شعر زیر بحث آخر الذکر شعر سے بھی زیادہ بلیغ اور لطیف ہے۔

وجاہت علی سندیلوی

ہر ایک ذرّہ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز

(1) عاشق کی خاک کا ہر ذرّہ آفتاب کی پرستش کرنے والا ہے۔خاک ہونے کے بعد بھی جلوۂ ناز معشوق کی آرزو نہ مٹی۔مطلب یہ ہے کہ جس طرح خاک کا ہر ذرّہ آفتاب کی شعاعوں میں چمکتا اور رقص کرتا نظر آتا ہے اسی طرح خاک عاشق کے ذرّے بھی آفتاب حسن یار سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

محمد عنایت اللہ

(2) مرنے کے بعد بھی عاشق کی آرزوئے جلوۂ ناز فنا نہیں ہوئی۔دیکھ لو۔اس کی خاک کا ہر ذرّہ آفتاب پرست ہے۔ذرّات آفتاب کی روشنی میں چمکتے ہیں۔ان کی چمک ہی سے یہ لطیف مضمون سوجھا ہے۔

آغا محمد باقر

(3) خاک کے ذرّے جب آفتاب کے مقابل ہوتے ہیں تو چمکنے لگتے ہیں۔غالبؔ نے ان کی تابانی کو ان کی آفتاب پرستی سے تعبیر کیا اور اسی سے شعر کا مضمون پیدا کیا ہے کہ فنا ہو جانے کے بعد بھی عاشق کے دل سے اشتیاق دید زائل نہیں ہوا۔دیکھ لو! اس خاک کا ہر ذرّہ آفتاب پرستی کر رہا ہے۔

سلیم چشتی

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

(1) ذرّہ ایک بے جان چیز ہے لیکن جب آفتاب کا پرتو اس پر پڑتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ سورج کی روشنی میں لاتعداد ذرات ہمیں حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، بالکل اس طرح تیرے ذوق کی بدولت کائنات میں جان پڑ گئی ہے گویا کائنات کی حیات تیرے پرتو سے ہے۔

آغا محمد باقر

(2) موجودات میں حرکت ذوق مبداء کی وجہ سے ہے اور یہی حرکت ان کے وجود وظہور کا باعث ہے۔ جس طرح انعکاس نور مہر کی حرکت ذرّہ میں جان ڈال دیتی ہے کہ وہ جھلملاتا معلوم ہوتا ہے۔

شاداں بلگرامی

(3) مادہ خود بے جان اور جامد ہے جو چیز مادہ کو تحریک وجنبش میں لاتی ہے وہ حرکت ہے۔ مگر حرکت خود اپنی ذات سے آفرینش کی قدرت نہیں رکھتی جب تک کہ متعین نہ ہو۔ اگر حرکت میں قاعدہ نہ ہوتا تو دنیا عالم فساد سے عالم کون میں نہ آسکتی پس علت العلل وہ ذات یا طاقت ہے جو حرکت کے پس پشت حرکت کو تعین دیتی ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری

غافل بہ وہم ناز ، خود آرا ہے ، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں ، طرۂ گیاہ کا

(1) غافل انسان اپنی خود آرائی کے وہم میں گرفتار ہے اور اپنی کارروائی پر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ حالاں کہ دنیا میں کوئی کام بغیر حکم قادر مطلق کے نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ گھاس جیسی ناچیز شئے کی زلف سنوارنے کے لئے اس نے صبا کو مقرر کر رکھا ہے تو ایسی حالت میں انسان کا اپنی کامیابی پر ناز کرنا جہالت کی دلیل ہے۔ تمام کامرانیاں لطفِ الٰہی سے منسوب ہونا چاہئے۔

عنایت اللہ

(2) ہر شئے فطری طور سے حسین ہے۔ انسان اپنی کوتاہیٔ فکر ونظر کی بناء پر اشیائے کائنات کو اپنے خیال کے مطابق آراستہ کرتا ہے تا کہ اپنے کمال آرٹ پر فخر کر سکے اور ہم چشموں سے بصد ناز (فخر و مباہات) یہ کہہ سکے کہ دیکھو فلاں شئے کو میں نے حسین بنا دیا۔

غالبؔ کی ذکاوتِ احساس اور اس کی کائناتی ہمدردی کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے۔

اختر اورینوی

(3) حسن خود آراء کو اپنی زیبائش کا غرور ہے۔ حالاں کہ اصلی حسن فطرت کا رہنِ منت ہوتا ہے۔ یہ فطرت ہی تو ہے جو لالے کی حنا بندی اور گھاس کے طرے میں شانہ کر کے اسے حسین بناتی ہے۔ فطری حسن کو مشاطگی کی حاجت نہیں ہوتی۔

یوسف حسین خاں

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

(1) موسم بہار میں طوفان مسرت سے ہر طرف چار موجیں اٹھتی ہیں یعنی موجِ گل یعنی ہر طرف رنگ برنگ کے پھول شگفتہ ہوتے ہیں۔ موجِ شفق یعنی آسمان پر ہر طرف شفق پھوٹتی ہے۔ موجِ صبا یعنی ہر طرف خوشگوار ہوائیں چلتی ہیں۔ موجِ شراب یعنی ہر طرف شراب کے دور چلتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے بہار کی پوری کیفیت بیان کی ہے۔

محمد عنایت اللہ

(2) عام طور پر ہمارے شاعروں اور دوسرے لوگوں کے یہاں بھی عیش وطرب سے ایسی سکونی کیفیت مراد ہوتی ہے جس میں دل کی ساری آرزوئیں پوری ہوجائیں۔ اس کے برعکس غالب کے یہاں عیش وطرب کا تصور بھی حرکی ہے۔ چنانچہ اپنے اس شعر میں انھوں نے بتایا ہے کہ عیش کے طوفان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا اور موجِ شراب کے اجزا ملیں گے۔ یہ تجزیہ ظاہر ہے کہ تحلیلی نہیں بلکہ تخئیلی ہے اور اسی میں اس کا سارا لطف پنہاں ہے۔ عیش وطرب کو طوفان کہنا غالب ہی کا حصّہ ہے۔

یوسف حسین خاں

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

(1) جس رشتۂ فنا میں تمام اوراق عالم سۓ ہوئے ہیں اُن سے بھولا ہوا نہیں ہوں یعنی فنا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

نظم طباطبائی

(2) اے غالب جادۂ راہِ فنا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ گویا اسے میں کبھی نہیں بھولتا کیوں کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کے اجزائے پریشاں رشتۂ فنا میں منسلک ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں چاہے ان میں کتنا ہی بتائن اور اختلاف کیوں نہ ہو، فنا ہو کر ایک ہو جاتی ہیں۔ گویا رشتۂ فنا میں تمام اوراق عالم سۓ ہوئے ہیں۔

آغا محمد باقر

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بے گانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

Publications * Andhra Pradesh, Hyderabad

بہار جن عناصر سے مرکب ہے ان میں دراصل کوئی مضبوط ربط نہیں۔ وحشت کے اجزا کی طرح پریشاں ہیں۔ سبزہ سب سے بے گانہ ہے۔ صبا سب سے دور دور آوارہ گھومتی ہے اور پھول سب سے نا آشنا ہو کر ایک ٹہنی پر جما رہتا ہے۔ وہ نہ اپنی جگہ سے چل کر کسی دوسرے سے ملنے جاتا ہے نہ کوئی دوسرا اس سے ملنے آتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ کم آمیز بلکہ نا آشنا ہے۔

گیان چند جین

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

(1) میرے وجود میں فنا کی ایک صورت موجود ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ ایک کسان کی سرگرمی و محنت خود اس کے کھلیان کی تباہی و بربادی کی موجب ہے۔ نہ کسان تخم ریزی، آبپاشی اور کٹائی پٹائی کرکے کھلیان جمع کرتا نہ اس پر بجلی گرتی۔ مفہوم یہ ہے کہ خود حیات ہی موت کا پیغام ہے۔

محمد عنایت اللہ

(2) انسان کے ساتھ اس کی موت بھی پیدا ہوتی ہے اور اس میں چھپی رہتی ہے۔ پھر وجود انسانی یا جسم انسانی کی نشو ونما اس لئے ہوتی ہے کہ موت مکین گاہ سے نکل کر اس کو فنا کردے۔ اگر وجود ہی نہ ہو تو موت بھی نہ ہو۔ گویا ہستی و نیستی لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح خرمن اور برق خرمن۔ اگر خرمن نہ ہو تو برق خرمن بھی نہ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ برق خرمن کا مادہ خود خرمن سے ہے اور خرمن دہقان کے خون گرم یا محنت کا نتیجہ ہے۔ اس لئے برق بھی گویا دہقان ہی کے خونِ گرم سے بنی ہے۔

شہاب الدین مصطفیٰ

(3) یہ شعر غالبؔ کے نہایت درجہ حکیمانہ اشعار میں سے ہے۔ یہ عالم عالمِ کون وفساد ہے۔ اس میں وجود مسلسل بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ تعمیر کے ساتھ تخریب اور زندگی کے ساتھ موت لگی ہوئی ہے۔ ہستیاں پیدا ہوتی پھلتی پھولتی اور پھیلتی ہیں لیکن نشو ونما کے کمال کے ساتھ ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی کا عام تجربہ ہے اور اس کا مشاہدہ اس قدر عام ہے کہ اس کے لئے کسی گہری بصیرت کی ضرورت نہیں۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ کسی چیز کی تعمیر اور تخریب بیک وقت اور بیک جا نہیں ہوتی۔ تعمیر کے کچھ عرصہ بعد تخریب ہوتی ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ یوں نہیں۔ بلکہ تعمیر کے دوران میں بھی تخریب کے عناصر اس کے اندر کارفرما ہوتے ہیں۔ ہر تعمیر کا ایک پہلو تعمیری ہوتا ہے اور دوسرا تخریبی۔ تخریبی عناصر شروع ہی سے کارفرما ہوتے ہیں۔ حکیمانہ نکتہ یہ ہے کہ یہ تخریبی عناصر کہیں خارج سے [illegible]

باعث ہوتا ہے وہی عنصر ایک خاص حد تک پہنچ کر اس کی تخریب کا موجب بن جاتا ہے۔ ہر زندہ چیز ایک لحاظ سے اسی وقت مرنا بھی شروع ہو جاتی ہے جس وقت اس کی زندگی کا آغاز ہوا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم

(4) مرزا غالب کا فلسفہ حیات ابن رشد سے مشابہ ہے۔ اندلس فلسفی نے بیان کیا ہے کہ مادہ ہمیشہ ہیولیٰ کا محتاج ہے۔ بے صورت مادہ کا تصور ناممکن ہے۔ ہیولے ارواح کی طرح مادہ سے صورت آشنا ہونے کے لئے پریشان علیحدہ تصور میں نہیں پھرتے بلکہ مادہ سے یک جاں ہیں۔ مادہ چوں کہ سافل ہے۔ مادہ کے جز و حیات ہونے سے کثافت اور خرابی عالم اجسام میں راہ پاتی ہے۔ مادہ کے ذریعہ زوال اور انحطاط ابتداء ہی سے جز و بدن ہو جاتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بجنوری

(5) ہمارے وجود اور ہستی کی فطرت میں خود فنا مضمر ہے۔ دوسرا مصرعہ بطور تمثیل ہے۔ کاشتکار کی سعی گویا برق خرمن کا مادہ ہے جتنی وہ سعی بہبودی کی کرتا ہے وہی مادہ برق خرمن بنتی جاتی ہے۔ محنت و کوشش باعث کی قوت فعلیہ (انرجی) ہوتی ہے اور حرارت عزیزی کا انحطاط و انتقاء باعث ضعف و فنا ہوتا ہے۔ (برق خرمن فنا کے لئے استعارہ مشہور ہے)۔

شاداں بلگرامی

(6) اس شعر میں شاعر نے ایک مسئلہ طب سے استفادہ کیا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ حرارت عزیزی باعثِ زندگی انسان ہے۔ خون تحلیل کرتی ہے تاکہ دوسرے قویٰ کے غذا بہم پہنچے۔ غرض وہ نتیجہ تحلیل خون بھی ہے اور خود بھی خون کو تحلیل کرتی ہے اور دونوں عملوں کے توازن سے ہستیٔ انسان قائم رہتی ہے۔ اسی کو شاعر کہتا ہے کہ میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔

آغا محمد باقر

(7) میں اپنی تباہی کا گلہ کس سے کروں جب کہ خود میری ساخت اور تعمیر میں خرابی کی صورت پوشیدہ ہے یعنی جس طرح دہقان کا محنت کر کے خرمن جمع کرنا بجلی گرنے کا باعث ہے۔ اسی طرح خود میرا وجود میری تباہی کا باعث ہے۔

نیاز فتح پوری

ماہُمائے گرمِ پروازیم فیض از ما مجوے
سایہ ہمچوں دود بالا می رود از بالِ ما

ہماری پرواز میں اس قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ سے اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔اسی طرح ہمارے پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا بلکہ دھوئیں کی طرح پروں کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے۔

حالی

چارہ درسنگ و گیاہ و رنج باجاں دار بود
پیش ازاں کیں در رسد، آں را مہیا کردہ

(1) بیماری تو جاندار کے ساتھ مخصوص تھی اور بیماری کا علاج سنگ و گیاہ یعنی معدنیات اور نباتات میں تھا، پس تو نے جانداروں کے پیدا کرنے سے پہلے سنگ و گیاہ کو مہیا کر دیا۔ جیسا کہ علم جیولوجی میں پہاڑوں اور درختوں کا حیوان اور انسان سے پہلے پیدا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

حاؔلی

(2) دنیا میں دکھ درد اور رنج موجود ہے۔ فطرت کو کیوں برا کہیں جو دفع مرض اور رفع رنج کے اسباب مصیبت سے قبل مہیا کرتا ہے۔ تا کہ انسان حکمت اور ہمت سے شر کے پہلو پر غالب آ جائے۔ حیوان و انسان کی بیماریوں کے علاج میں جو دوائیں استعمال کی جاتی ہیں، وہ یا نباتی ہوتی ہیں یا جمادی۔ کلامِ غالب میں ارتقائے حیات کے اشارے ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے نباتات اور جمادات کا وجود انسان اور حیوانات سے پہلے ظہور میں آیا اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علاج بیماری سے قبل پیدا کیا گیا۔ یہ خالق فطرت کے رحیم ہونے کا ثبوت ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

آئین حیات کے مطابق رنج و مرض کا ظہور لازم تھا۔ اگر فطرت پیش بندی کر کے اس کا مداوا پہلے سے مہیا نہ کرتی تو اسے بے نیاز یا ظالم کہہ سکتے تھے۔ لیکن کوئی مرض ایسا نہیں جس کا علاج فطرت کے آئین کے نذر ہی وجود نہ ہو اور جس کے اسباب مہیا نہ ہوں۔ دوائیں زیادہ تر جمادات و نباتات سے بنتی ہیں اور بیماریاں جانداروں میں ہوتی ہیں۔ ارتقاء کی زمانی ترتیب میں سنگ و گیاہ یعنی جمادات و نباتات کی آفرینش حیوانات اور انسان سے پیشتر ہوئی۔ جدید سائنس بھی اس مسئلے میں غالؔب کی مؤید ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم

دودِ سودائے تتق بست آسماں نامیدمش
دیدہ برخوابِ پریشاں زد، جہاں نامیدمش

دنیا و مافیہا کا ہیچ ہونا بیان کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ ایک خیالی دھواں اٹھ کر شامیانہ سا بن گیا ہم نے اس کا نام آسمان رکھ لیا۔ اور آنکھ کو ایک پریشان خواب نظر آیا اس کو جہاں سمجھ گئے۔

حالؔی

گل زار دمیدن شرستان رمیدن
فرصت تپش و حوصلۂ نشو و نما ہیچ

مادّے کو برقی لہروں سے مرادف سمجھنے کا رجحان اس شعر میں دیکھیے۔

حامدی کاشمیری

باد دامن زد بر آتش، نو بہاراں خواندمش
داغ گشت آں شعلہ از مستی خزاں نامیدمش

چوں کہ، نو بہار میں تمام جذبات نفسانی جوش میں آتے ہیں اور عشق و ہوس کی تحریک ہوتی ہے اس لئے بہار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا نے آگ کو دامن سے سلگایا۔ میں نے اس کو بہار قرار دے دیا۔ اور جب وہ شعلہ بجھا تو میں نے اس کا خزاں نام رکھ دیا۔

حالؔی

کتابیات

1 - وثوق صراحت — عبدالولی والہ

2 - یادگارِ غالب — الطاف حسین حالی

3 - اردو دیوان غالب معہ شرح نظامی — نظامی بدایونی

4 - محاسن کلامِ غالب — عبدالرحمٰن بجنوری

5 - ہدیہ سعید — سعیدالدین احمد

6 - الہاماتِ غالب — ملک محمد عنایت اللہ

7 - شرح دیوانِ غالب — محمد احمد بے خود موہانی

8 - بیان غالب شرح دیوان غالب — آغا محمد باقر

9 - افکارِ غالب — خلیفہ عبدالحکیم

10 - ترجمانِ غالب — سید شہاب الدین مصطفٰی

11 - شرح دیوانِ غالب — یوسف سلیم چشتی

12 - باقیاتِ غالب — وجاہت علی سندیلوی

13 - فکرِ غالب — پرتھوی چندر

14 - مشکلات غالب — نیاز فتح پوری

15 - شرح دیوانِ اردوئے غالب — نظم طباطبائی

16 - شرح دیوانِ غالب — حسرت موہانی

17 - روح المطالب فی شرح دیوانِ غالب — شاداں بلگرامی

18 - غالب کے تخلیقی سرچشمے — حامدی کاشمیری

19 - نقشِ غالب — اسلوب احمد انصاری

20 - غالب اور آہنگِ غالب — یوسف حسین خاں

21 - تفسیر غالب — گیان چند جین

22 - عرفانِ غالب — مرتب : آل احمد سرور

23 - تفہیم غالب — شمس الرحمٰن فاروقی

24 - غالب شناسی ۲ — ظ-انصاری

25 - فلسفی غالب — احمد رضا

26 - غالب، شخص اور شاعر — مجنوں گورکھپوری

27 - عیارِ غالب — مرتب : مالک رام

28 - فلسفہ کلام غالب — شوکت سبزواری

29- مرزا غالب — نتالیہ پری گارنا مترجم : اسامہ فاروقی

30 - غالب نامہ — شیخ محمد اکرام

31 - بین الاقوامی غالب سیمنار 1969ء — مرتب : یوسف حسین خاں

32 - مجلّہ غالب نامہ جولائی 1981ء — مدیر : پروفیسر نذیر احمد

33 - مجلّہ غالب نامہ جولائی 1982ء — مدیر : پروفیسر نذیر احمد

34 - مجلّہ غالب نامہ جولائی 1987ء — مدیر : پروفیسر نذیر احمد

35 - خطوطِ غالب — مرتب : مالک رام

36 - دیوان غالب جدید (نسخہ حمیدیہ) — مفتی محمد انوار الحق

37 - دیوانِ غالب — تاج ایڈیشن لاہور

38 - دیوانِ غالب — ایجوکیشن بک ہاوز علی گڈھ

39 - ہفتہ وار ''خیام'' لاہور 8/جولائی 1944ء — مدیر : حافظ محمد عالم

40 - رسالہ ''اوراق'' لاہور شمارہ مئی جون 1983ء — مدیر : وزیر آغا

41 - ''اخبار اردو'' اسلام آباد فروری 1998ء — مقتدرہ قومی زبان